ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

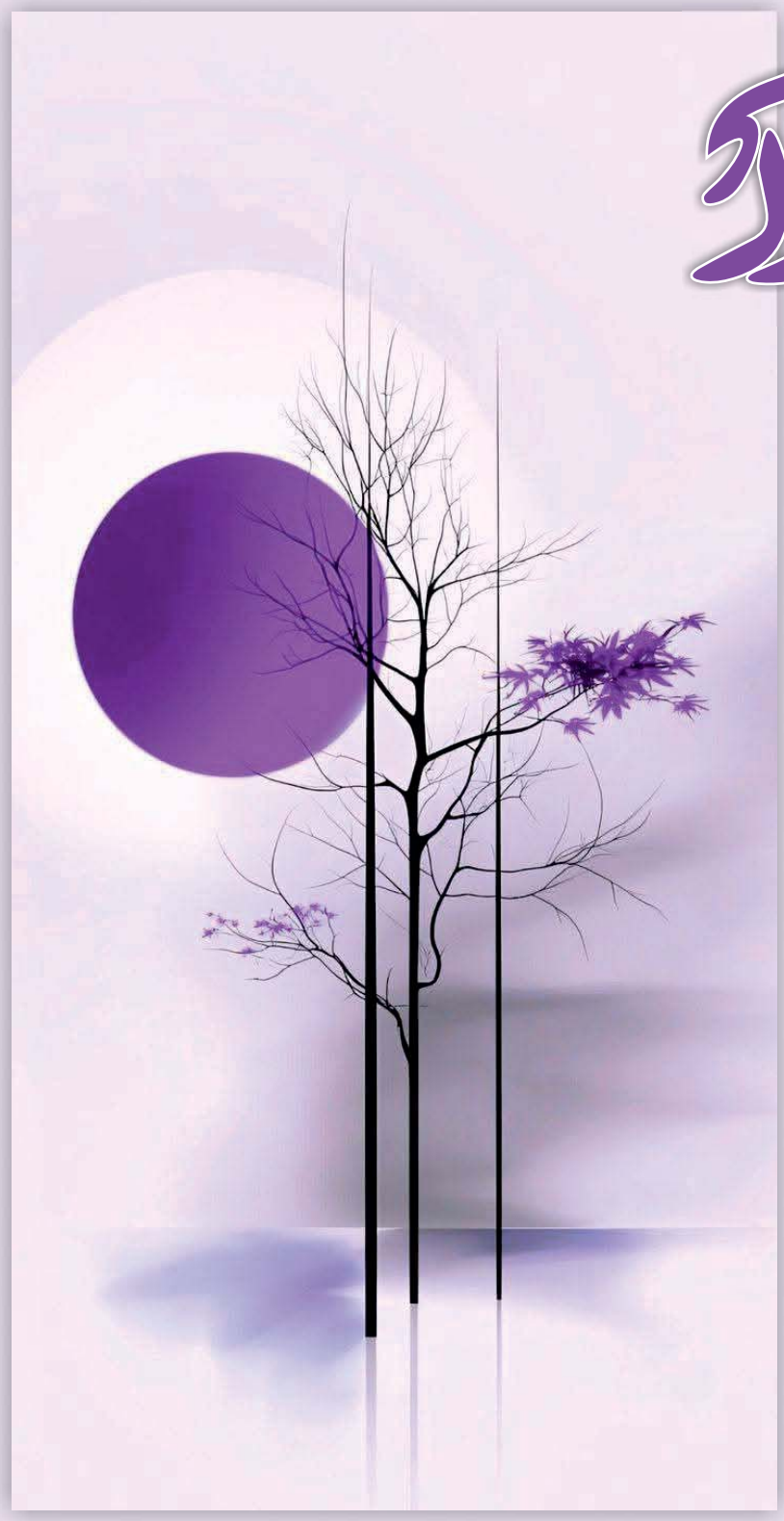

اپریل ۲۰۲۵ء

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

۱۵/روپے

عزتمآب گورنر آنندی بین پٹیل کا جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ اسمبلی ہاؤس میں استقبال کرتے ہوئے۔

ماگھ پورنیما کے موقع پر عقیدت مندوں کے ہجوم کا ایک منظر۔

جلد:79 شمارہ:12

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

اپریل ۲۰۲۵ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

پبلشر: جناب وشال سنگھ (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب اروند کمار مشر (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

آسیہ خاتون

7705800986

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ:

صبا عرفی:7705800953

تزئین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پیکچرس، گولہ گنج، لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اترپردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰/روپئے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اترپردیش، لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relation Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیادور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعۂ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیادور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اترپردیش، لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ

اپنی بات		۲

مضامین

ساحرلدھیانوی کی تلخیاں	پروفیسر ثوبان سعید	۳
پروین شاکر کی نثری نظمیں	ڈاکٹر عبدالسمیع	۷
بشیر بدر: محبت، تہذیب اور رزم استعاروں کا آمیزہ	احمد نثار	۱۱
فہمیدہ ریاض کی شاعری میں نسائی جہتیں	ڈاکٹر صائمہ ثمرین	۱۴
کیفی کی شعری کائنات کے تین رنگ	محمد فیصل خان	۱۷

منظومات

غزل	صدام حسین مضمر علیگ	۶
غزلیں	مصداق اعظمی/ ڈاکٹر محمد شفیع سیتاپوری	۲۱
غزلیں	کلیم رہبر/شعیب اختر	۲۲
غزل	سید نازش احمد افق اعظمی	۲۵

افسانہ

بارش اور پیاس	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۲۳
چھلانگ	اشتیاق سعید	۲۶
بھنور ماضی اور حال کا	سید احمد قادری	۲۹

تبصرہ

اردو کی برکتیں	مصنف: جہانگیر انس/ مبصر: قمر عباس قمر	۳۱

ترقیات

نئے بھارت کا نیا اترپردیش	شیبا	۳۲

ماہنامہ نیا دور information.up.nic.in ویب سائیٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے　　سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسّی روپے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیادور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اترپردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

اپریل ۲۰۲۵ء کا شمارہ قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہے۔ **گزشتہ سے پیوستہ**

کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفیؔ اردو ہماری ہے

"ماہنامہ نیا دور" کے گزشتہ اداریہ میں اردو سماجیات کے کچھ ایسے عصری معروضات کو ضبط تحریر کرنے کی کوشش کی، جسے میں ضروری سمجھ رہی تھی۔ میں نے بغیر کسی پس وپیش کے اپنے موقف کا اظہار کر دیا، جس کی تائید وتوثیق اور اختلاف رائے کا جمہوری حق آپ کے پاس محفوظ ہے۔ اردو زبان وادب سے ہماری خوش گمانی کا تعلق حقیقت کی زمین سے قطعی ارتباط نہیں رکھتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم اردو زبان کے فروغ سے کہیں زیادہ حزب اختلاف کی طرف سے زبان کی مخالفت میں اُڑائی جانے والی افواہوں پر کان دھرے ہوئے ہیں۔ جس کی مثال بہت سے ایسے اشعار ہیں جس کے سہارے ہم اردو زبان کے دفاع کے لئے قلعہ بندی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس بات کو ثابت کرنے میں منہمک ہیں کہ اردو زبان ہمارے عظیم بھارت کی ایک تابدار روایت کا حصہ ہے۔ جسے گنگا جمنی تہذیب کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ کچھ ایسے مقبول ترین اشعار جو اردو زبان کے انقلابی نعرے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں سر دست آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

سگی بہنوں کا جو رشتہ ہے اردو اور ہندی میں
کہیں دنیا کی دو زندہ زبانوں میں نہیں ملتا

منور رانا

ملاؔ بنا دیا ہے اسے بھی محاذ جنگ
اک صلح کا پیام تھی اردو زباں کبھی

آنند نرائن ملا

جہاں جہاں کوئی اردو زبان بولتا ہے
وہیں وہیں مرا ہندوستان بولتا ہے

منصور عثمانی

اس طرح کے بہت سے ضرب المثال اشعار موجود ہیں، ہم جس کا استعمال اس کے پیش رفت معنی سے الگ ہٹ کر اپنے ناروا تصرافات کے جواز کے طور پر کرتے ہیں، حالانکہ یہ قطعی درست نہیں بلکہ اردو زبان کے لئے ضروری ہے کی زمینی سطح پر کام کیا جائے، نا کہ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کی مراعات کے حصول کے لئے، ورنہ وہ دن دور نہیں کہ ہم اپنی آنے والی نسل کو صرف اردو زبان کے قصہ سنائیں گے۔ شان الحق حقی کا یہ دشعر میرے موقف کی تائید کے لئے کتنا مناسب لگتا ہے، شعر ملاحظہ کریں۔

وائے طلسم نقش فرنگ
بھول گیا اردو بھی میں

امید کرتی ہوں یہ شمارہ سابقہ شماروں کی طرح پسند خاطر ہوگا۔ آپ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں نوازتے رہیں۔ شکریہ

آسیہ خاتون

یہ شمارہ اپریل ۲۰۲۵ء کا ہے جس کو اپریل ۲۰۲۶ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر ثوبان سعید
خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ
9411827716

ساحرؔ لدھیانوی کی تلخیاں

''تلخیاں''، مشہور ترقی پسند شاعر ساحرؔ لدھیانوی کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو سنہ 1945ء میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوا تھا۔ مجموعے کے منظر عام پر آنے کے ساتھ ہی ساحرؔ آسمانِ اردو ادب کا ایک درخشندہ ستارہ بن گئے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ اس کتاب کے مختلف ایڈیشن شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں اور یہ ساحرؔ کی مقبولیت کی بڑی دلیل ہیں۔ ''تلخیاں'' کی تمام تر تخلیقات اس دور کی ہیں جب ساحرؔ ابھی کالج کے طالب علم تھے۔ اس لیے ساحرؔ کی زندگی اور اس کے نشیب و فراز کو سمجھے بغیر تلخیاں کا صحیح محاکمہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ ساحرؔ کے ساتھ نامناسب بات بھی ہوگی اور اس کے فن کے ساتھ ناانصافی بھی۔

کچھ ایسا ہوا تھا کہ سنہ 1921ء میں لدھیانہ کے ایک جاگیر دار گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ بدقسمتی سے بچے کے والدین میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ آخر کار بچے کی ماں نے اپنے شوہر کی زیادتیوں سے تنگ آ کر علاحدگی اختیار کرلی۔ وہ بچہ بھی اپنی ماں کے ساتھ ساتھ رہا۔ ظاہر ہے اس بے سروسامانی اور کس مپرسی کے عالم میں ناامیدیاں اور محرومیاں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ بچہ چوں کہ ہونہار تھا اور اس نے باپ کے گھر میں عیش و عشرت کی محفلیں دیکھی تھیں، اس لیے وہ چیز اس کے لاشعور کا حصہ بن گئی، جس نے اس کی نفسیات کو متاثر کیا۔ بہرحال بات ماں کے زیورات فروخت کرنے تک آپہنچی۔ ادھر بچے کے والد نے بچے کو قتل کر دینے کی دھمکی دی یا کم از کم اسے اپنی ماں کے پاس نہ رہنے دینے کے لیے رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں۔ اس خدشے کے پیشِ نظر بچے کی ماں نے چند افراد کو اس کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ بچہ خوف و دہشت اور عدم تحفظ کے ماحول میں پرورش پانے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ ذہنی الجھن کا شکار ہوگیا۔ عنفوانِ شباب میں اس نے محبت بھی کی جو اس کی غربت، کم حوصلگی اور سماجی بندشوں کے سبب کامیاب نہ ہو سکی۔ ذہنی انتشار اور معاشی بدحالی نے اس کے حواس باختہ کر دیے۔ قدم قدم پر غم و مسرت کی جنگ ہوئی، عقل اور جذبے میں ٹکراؤ ہونے لگا اور ان سب عناصر نے مل کر ایک معصوم بچے کو ایک انقلابی اور ترقی پسند شاعر بنا دیا۔ اس کے تجربات و حوادث شعر کے قالب میں ڈھل کر باہر آنے لگے اور اس طرح وہ معصوم بچہ ایک دن صاحب تصنیف ہوگیا۔ بچے کا نام عبدالحئی تھا۔ اس نے ساحرؔ کے تخلص سے شہرت و ناموری حاصل کی، اور اس کے مجموعے کا نام ''تلخیاں'' تھا جس کے سرنامے پر یہ شعر درج ہے، جو اس کے حقیقی حالات و حادثات کی عکاسی کرتا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحرؔ نے اس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا تھا جب اقبالؔ، جوشؔ، جگرؔ اور فراقؔ کے نغموں کے بعد فیضؔ اور مجازؔ کے نغمے فضا میں رنگ و نور بکھیر رہے تھے۔ ان حالات میں کوئی نوآموز شاعر ان شعرا کی اثر پذیری سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ فیضؔ کی مشہور نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' اس زمانے میں نوجوان طبقے کی دل کی دھڑکن بنی ہوئی تھی۔ ساحرؔ بھی اس اثر سے اپنا دامن بچا نہیں سکے۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں

> ''بہت جلد ساحرؔ نے خود کو اس محدود دنیا سے آزاد کرلیا۔ رفتہ رفتہ ان کا غم غمِ گیتی میں تبدیل ہونے لگا۔ ساحرؔ نے گردوپیش اور ماحول کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دنیا ایک اور ہی مصیبت میں گرفتار ہے، اس کا آزار میری ذاتی تکالیف سے زیادہ شدید ہے۔ اسے میرے نغموں کی ضرورت ہے، چناں چہ ساحرؔ کا نظریہ خالص ترقی پسندانہ بن گیا۔ غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور عورتوں کے مسائل کی ترجمانی کرنا شاعر کا شیوہ بن گیا۔ ساحرؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ ان عصری موضوعات پر لکھنے کے باوجود بھی اس کے قلم میں تلخی کی لے ایک خاص نشان سے آگے نہیں بڑھی۔ اس میں رومانیت اور تغزل کی کارفرمائی پھر بھی باقی رہی۔ یہاں بھی اس کا وہی مخصوص لب ولہجہ رنگ دکھاتا ہے جو اس نے رومانوی شاعری کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔''

ساحرؔ کی ابتدائی دور کی نظموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ فیضؔ اور مجازؔ کا تتبع کر رہے ہیں۔ وہی رومانی فضا، تراشیدہ جملے اور خواب آور ماحول ہے مگر جلد ہی ساحرؔ نے انھیں اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ ذاتی تجربات اور جاگیرداری کے خلاف نفرت کے جذبے نے ان پر مہمیز کا کام کیا اور دنیاوی تلخیوں نے انھیں شعور کا راستہ دکھایا۔ جاگیرداری کے خلاف ساحرؔ کے لاشعور میں نفرت کا جو لاوا پک رہا تھا وہ اس صورت میں باہر نکلتا ہے:

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنھوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سایے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

ساحرؔ بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر تھا۔ اس کی ابتدائی شاعری میں وہ سب عناصر موجود ہیں جو کسی رومانی شاعری کا خاصہ ہوا کرتے ہیں۔ کالج کا ایک طالب علم جب اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو اسے بغاوت کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا انقلابی تصور بھی سراسر رومانی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کو بغاوت کے لیے آمادہ تو کرتا ہے مگر خود اس کے اندر اتنی ہمت نہیں کہ سماجی بندشوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے، لاچار ہو کر کہتا ہے:

عہدِ گم گشتہ کی تصویر دکھاتی کیوں ہو
ایک آوارۂ منزل کو ستاتی کیوں ہو
زندگی شعلۂ بے باک بنالو اپنی
خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو
جب تمھیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر لو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

(یکسوئی)

ساحرؔ کی ابتدائی دور کی نظموں میں اس کی تمام تر کائنات اس کی معشوقہ ہے اور اسی میں وہ اپنی عاقبت دیکھتا ہے:

میرے خوابوں کو جھروکوں سے سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں

*

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

مگر بہت جلد ساحرؔ نے خود کو اس محدود دنیا سے آزاد کر لیا۔ رفتہ رفتہ ان کا غم غمِ گیتی میں تبدیل ہونے لگا۔ ساحرؔ نے گرد و پیش اور ماحول کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دنیا ایک اور ہی مصیبت میں گرفتار ہے، اس کا آزار میری ذاتی تکالیف سے زیادہ شدید ہے۔ اسے میرے نغموں کی ضرورت ہے، چناں چہ ساحرؔ کا نظریہ خالص ترقی پسندانہ بن گیا۔ غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور عورتوں کے مسائل کی ترجمانی کرنا شاعر کا شیوہ بن گیا۔ ساحرؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ ان عصری موضوعات پر لکھنے کے باوجود بھی اس کے قلم میں تلخی کی لے ایک خاص نشان سے آگے نہیں بڑھی۔ اس میں رومانیت اور تغزل کی کارفرمائی پھر بھی باقی رہی۔ یہاں بھی اس کا وہی مخصوص لب و لہجہ رنگ دکھاتا ہے جو اس نے رومانوی شاعری کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ چند اشعار کی مدد سے ہم ساحرؔ کے ذہنی ارتقا کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں:

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اور آخر کار اس نے عوامی مسائل کو بھی شعری پیکر اور زبان دے دی:

اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکل گیتی سنوارنے

*

ترے عارض پہ ڈھلکتے ہوئے سیمیں آنسو
مری افسردگیِ غم کا مداوا تو نہیں

*

تمھارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے میں یک لحظہ پا نہیں سکتا

*

یہ اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر اک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا

*

یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ

*

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

شکست، کسی کو اداس دیکھ کر، میرے گیت، گریز، مجھے سوچنے دے وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو اس کے ذہنی ارتقا کی گواہی دیتی ہیں کہ ساحرؔ رومان سے انقلاب اور انفرادیت سے اجتماعیت کی جانب کس انداز میں رواں دواں تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ ساحرؔ نے دبے کچلے عوام کے کرب کو صرف بیان کیا ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ان غموں سے لڑنے اور ان پر فتح پانے اور سماج کے اندر ایک خوشی کی لہر پھیلانے کا خواہش مند بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے ان موضوعات کو اپنانے تک اتنی چابک دستی نہیں دکھائی جو اس نے اپنے محبوب موضوع 'محبت' کو لے کر برتی ہے۔ پھر بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں کہ ساحرؔ نے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے اور اپنی شاعری میں ان موضوعات پر خلوصِ دل سے قلم اٹھایا ہے، ایک دو مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمارخانے میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے

(لمحۂ غنیمت)

اک نیا سورج چمکا ہے ایک انوکھی ضو بازاری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

ساحرؔ رومان کی وادی سے نکل کر انقلاب کی دنیا میں آئے تھے۔ شروع شروع میں تو ان کا انقلابی تصور رومانی تھا مگر بعد میں انھوں نے خالص ترقی پسندی کے نظریے کی توسیع کی۔ اگرچہ ان کی نظموں میں فیضؔ کی سی ہمہ گیری اور سماجی مسائل پر گہری نظر کا فقدان ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اس سمت میں ایک مثبت قدم بڑھایا تھا۔ طبقاتی کش مکش کا بیان جو ترقی پسند تحریک کا ایک اہم بنیادی رجحان تھا، ان کی نظموں میں خاص طور سے ملتا ہے۔ شکست، تاج محل، آج کل، آج اور طلوعِ اشتراکیت اس رجحان کی نمائندہ نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔

وقت کی دھڑکتی نبضوں کو اپنی گرفت میں رکھنے کی وجہ سے ساحرؔ نے ان تمام واقعات پر بڑی فن کاری سے قلم اٹھایا ہے جو اس وقت دنیا میں وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کا سانحہ، قحط بنگال، جہازیوں کی بغاوت، روسی انقلاب، ہند پاک جنگ؛ غرض یہ کہ شاید ہی کوئی معاصر موضوع ہو جس پر ساحرؔ ایک دردمند انسان کی حیثیت سے متفکر نظر نہ آتے ہوں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اور ہندوستان پاکستان جنگ چھڑنے کے بعد امن عالم ایک بڑا چیلنج تھا۔ پوری دنیا جنگ کا ایندھن بن گئی تھی۔ ان حالات میں ساحرؔ کا دل دردمند تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ اپنے ترقی پسندانہ نظریے کا برملا اظہار 'اے شریف انسانو!' میں کرتے ہیں۔ گویا ساحرؔ اپنے گرد و پیش کی زندگی اور اس کے مسائل سے کبھی بھی دامن کش نہیں ہوتے۔

پھوٹ پڑیں مشرق سے کرنیں
حال بنا ماضی کا فسانہ
گونجا مستقبل کا ترانہ
بھیجے ہیں احباب نے تحفے
اٹے پڑے ہیں میز کے کونے
دلھن بنی ہوئی ہیں راہیں
جشن مناؤ سالِ نو کے

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
جاگے ہیں افلاس کے مارے، اٹھے ہیں بے بس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم آنکھوں میں بجلی کے شرارے

یہ ایسے اشعار ہیں جو ساحرؔ کے سیاسی شعور کی غمازی کرتے ہیں اور ایک انقلابی لے پر ختم ہوتے ہیں۔ بنگال، یہ کس کا لہو ہے، نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو، لہو ندر دے رہی ہے حیات اور آوازِ آدم اسی نوعیت کی اہم نظمیں ہیں۔

جہاں تک تلخیاں کی زبان اور اسلوب کا معاملہ ہے تو ساحرؔ نے اس میں بڑی دل کش اور بامحاورہ زبان استعمال کی ہے۔ کتاب شروع سے اخیر تک پڑھ جائیے کہیں آپ کو اس کی زبان میں کھردرا پن نہیں معلوم ہوگا۔ الفاظ کی نشست، جملوں کی تراش، تراکیب کا سلیقہ اور مصرعوں کی برجستگی ساحرؔ کے کہنہ مشق شاعر ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات نظم میں شروع کسی اور بحر سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام کسی اور بحر میں ہوتا ہے۔ یہ ادبی دیدہ دلیری والا معاملہ معلوم ہوتا ہے جس پر مزید غور و فکر کی گنجائش باقی ہے۔

ساحرؔ کی رومان پرستی زبان اور اسلوب کی سطح پر بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ محسوس ہونے والی اشیا کو مجسم کر دینا یہ ساحرؔ کی رومان پرستی کی ہی دلیل کہا جائے گا۔ پگڈنڈیوں سے پیڑوں کے سایے کا لپٹنا، ماضی کے ایام کا ہاتھ ہلانا، امیدوں کا دامن چھوڑ دینا وغیرہ ایسی تراکیب ہیں جن میں لمسیاتی اور تجسیمی کیفیت موجود ہے اور یہ تمام تراکیب حرکت سے معمور ہیں۔ کبھی کبھی غیر مرئی اور غیر دلچسپ مضامین کو ساحرؔ اپنی صورت گری سے دل آویز اور دل کش بنا دیتے ہیں:

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوئی نے سوچا تھا

بادل پہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے میں
دوشِ ہوا کے مے خانے ہی مے خانے گھر آئے ہیں
رت بدلے گی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے
اجلے اجلے کھیتوں میں رنگیں آنچل لہرائیں گے

ایک عام سی کیفیت یا ایک عام سے واقعے کو ڈرامائی انداز سے بیان کرنے میں بھی ساحرؔ بے مثل ہیں۔ جرمنی اور انگلستان بہت زمانے سے مشرقی اقوام کی تقدیر کے ساتھ جوا کھیلتے آئے ہیں۔ ان کے ظلم و استبداد کو ساحرؔ نے 'لمحۂ غنیمت'' میں اس طرح پیش کیا ہے:

مسکرا اے زمین تیرہ و تار
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے

اسی طرح ان کی مشہور نظم 'چکلے'' میں کیفیاتی ارتقا تو نہیں ہے لیکن ہر بند ایک خطیبانہ للکار پر ختم ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی جیسی مربوط اور منظم نظمیں اردو شاعری میں کم ہیں۔ ہر مصرع ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے اور نظم جب آخری مصرعے پر پہنچ کر ختم ہوتی ہے تو پھر شاعر اسی جگہ ایک جھٹکے کے ساتھ آپہنچتا ہے جہاں سے اس نے سفر کی شروعات کی تھی گویا پوری زندگی ایک دائرے کی شکل میں گردش کر رہی ہے:

سوچتا ہوں مگر یوں ہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

اگرچہ ساحرؔ پر سلام مچھلی شہری، مجازؔ، فیضؔ، سردار اور اختر شیرانی کے وسیع اثرات ہیں مگر اس کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو لہجے کے ٹھہراؤ، نغمگی اور لطیف تصورات کی مرقع سازی سے منفرد رنگ جمانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ تاج محل، کبھی کبھی، میرے عہد کے حسینو، میرے گیت تمھارے ہیں، خوب صورت موڑ اور فن کار ایسی نظمیں ہیں جن سے ساحرؔ کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔

ساحرؔ نے نظمیں اور غزلیں دونوں لکھی ہیں۔ ساحرؔ کی غزلوں میں تغزل اور نغمگی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ کبھی محبوب سے سرگوشی، کبھی اس کے دامن میں رہ کر زندگی کے دن گزار دینا، کبھی غم دوراں، کبھی تلخیِ ایام، کبھی ناکامی، انقلاب، اجتماعی شعور اور خود کو اس میں گم کر دینے کا جذبہ انھیں عناصر و موضوعات سے ساحرؔ کی غزلوں کا خمیر تیار ہوا ہے۔ اس کے ساتھ سہل اور آسان زبان کے استعمال، مترنم لفظوں کے انتخاب پر ماہرانہ گرفت نے ان کی غزلوں میں چمک پیدا کر دی ہے جو ایک طرف کلاسیکی رچاؤ سے بھرپور نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود ساحرؔ اپنے محبوب کے آگے مجبورِ محض نہیں بلکہ ناکامی کے بعد خود کو دنیا کی بھیڑ میں گم کر لیتے ہیں اور اگر کبھی اس محبوب کی قربت حاصل ہوتی ہے تو بھی اپنے فرض سے

غافل نہیں ہوتا۔ چند اشعار دیکھیے جو شاید ساحرؔ کی زندگی کے اس پہلو کو اجاگر کر سکیں:

انھیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

*

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

*

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

*

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

*

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں

*

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

غرض یہ کہ اگر ساحرؔ کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر تلخیاں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ایک نوجوان نے رومانس کی دنیا میں قدم رکھا اور وہیں سے شاعری کی دیوی کے قدموں میں سر جھکا دیا۔ مگر جب رومانی شیش محل ٹوٹ گیا تو گرد و پیش کی حقیقی اور تلخ زندگی پر نظر پڑی تو اس نے خود کو اجتماعیت کے حوالے کر دیا۔ اس نے ان کے لیے گیت لکھے۔ پرچم لہرانے والوں کی خاطر بربط پر گانے لگا۔ انقلاب کے ترانے چھیڑے مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ لبرل ازم کی طرف مائل ہوا اور انقلاب کی جگہ امن و آشتی، صلح و صفا کے اقدار کا مغنی بن گیا۔ اور ان سبھی منازل میں وہ سماجی شرکتوں کے شاعر کے طور پر ہی سامنے آتا رہا۔ ساحرؔ نے ان تمام موضوعات پر جس انداز میں قلم اٹھایا ہے اس میں گہرائی نہیں ہونے کے باوجود بھی اثر ہے، خلوص ہے اور محبت کا وہ نغمہ ہے جو ہمیں اس کی شاعری کو دماغ سے زیادہ دل سے قریب رکھتا ہے اور اس نظر سے شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کو ساحرؔ کی شاعری کبھی محروم نہیں کرے گی۔

حوالہ جات

1۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
2۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
3۔ تلخیاں، ساحر لدھیانوی، مکتبہ اردو، لاہور
4۔ اردو میں قومی شاعری کے سو سال، علی جواد زیدی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
5۔ لاہور کا جو ذکر کیا، گوپال متل، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
6۔ اردو میں رومانوی تحریک، محمد حسن، علی گڑھ
7۔ ساحرؔ: شخص اور شاعر، ناز صدیقی، اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی
8۔ ساحر لدھیانوی: شخصیت اور کارنامے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

❑❑❑

غزل

کچھ ایسے محوِ حیرت کر گئے ہیں
نظر ٹھہری رہی منظر گئے ہیں!

وہ جس رستے گئے فرہاد و مجنوں
ہمیں جانا نہیں تھا، پر گئے ہیں!

ہمارے سر اذیت ہی اذیت
مگر تمغے تمھارے سر گئے ہیں

حسین ابن علی پر جاں نچھاور
یزیدانِ زماں سے ڈر گئے ہیں؟

مری تکلیف بڑھتی جا رہی ہے
کہ میرے زخم تھوڑے بھر گئے ہیں

میں ان لوگوں کی خاطر جی رہا ہوں
وہی جو لوگ مجھ پر مر گئے ہیں

مرے کاندھوں پہ کتنا بوجھ آیا
مرے کاندھوں پہ کتنے سر گئے ہیں!

صدام حسین مضمر علیگ

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

9520208720

ڈاکٹر عبدالسمیع

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

9891553520

پروین شاکر کی نثری نظمیں

پروین شاکر کا نام لیتے ہی ہمارا ذہن ایک خاص سمت میں سفر کرنے لگتا ہے جس میں دبی دبی مسکراہٹ، افسردہ رومانیت اور مخصوص نسائی لب و لہجے کی فضا حاوی رہتی ہے۔ ان کی شعری شخصیت کی اس فضابندی میں کچھ تو ان کی تخلیقی شخصیت کا بھی حصہ رہا ہے لیکن اس اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ اس میں ناقدین اور ادب کے طالب علموں کی تن آسانی اور سہولت پسندی کا دخل زیادہ رہا ہے۔ پروین شاکر کے ناقدین انھیں اُسی مخصوص دائرے میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ روایت اور کلیشے کے ذریعے کسی بھی فن پارے یا شخصیت کو سمجھنے میں یہ سہولت حاصل ہوتی کہ کچھ خاص قسم کی تراکیب، اصطلاحات اور روایتی جملوں سے کام نکل جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پروین شاکر کی شہرت ان کی غزلوں اور مخصوص نسائی لب و لہجے سے قائم ہوئی لیکن ان کے مطالعے اور محاکمے میں انھیں غزلوں اور نظموں کو حوالہ بنایا جاتا رہا ہے جن میں افسردہ رومانیت کی فضا حاوی ہے اور جو غزل کی مخصوص روایتی عشقیہ واردات کے بیان سے عبارت ہیں۔ حالانکہ ان کی بعض غزلوں میں ان کا تیور تیکھا اور تلخ بھی ہو گیا ہے لیکن جن لوگوں نے انھیں سرسری طور پر پڑھنے کی کوشش ہے وہ ان تلخیوں اور کڑواہٹوں تک نہیں پہنچ سکے جو ان کی تخلیقات کے بین السطور میں جاری اور ساری ہیں۔ پروین شاکر کے مطالعے کا تقاضہ ہے کہ ان کی نظموں بالخصوص نثری نظموں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔ ان نظموں میں پروین شاکر کی شخصیت اور ان کا تیور ان کی غزلوں سے قدرے مختلف نظر آتا ہے۔ یہاں تفکر، غور و فکر اور ایک الگ قسم کی انسانی دردمندی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

پروین شاکر جس عہد میں شاعری کر رہی تھیں اس میں نثری نظم کا نہ صرف تجربہ ہو چکا تھا بلکہ اس کے فروغ کی تحریک بھی جاری تھی۔ ان کے معاصر شعرا میں بالعموم اور شاعرات میں بالخصوص نثری نظم لکھنے کا چلن عام ہو چکا تھا۔ نئے لکھنے والوں کی بڑی تعداد اس نئی صنف کی طرف مائل تھی۔ گو کہ مختلف ادبی مراکز سے اس کے خلاف آواز بھی بلند کی گئی اور اسے ناکام اور غیر سنجیدہ تجربہ قرار دے کر اس سے گریز بھی اختیار کیا گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ اُس عہد کے بہترین تخلیق کاروں نے اِس صنف میں طبع آزمائی کی اور اِسے تخلیقی اساس فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ پروین شاکر کی شہرت اور مقبولیت ان کی غزلوں اور موزوں نظموں سے قائم ہو چکی تھی لیکن بعض موضوعات کے اظہار کے لیے انھوں نے نثری نظم کو نہ صرف بطور وسیلۂ اظہار اختیار کیا بلکہ اپنی مخصوص رومانی شاعری پر ایک طرح سے ندامت کا اظہار بھی کیا ہے۔ جس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ نثری نظم میں حقائق کا سامنا کرنے اور حقائق کو تخلیقی تجربے میں ڈھالنے کی قوت زیادہ ہے۔

پروین شاکر کے شعری مجموعہ 'انکار' میں تقریباً دو درجن نثری نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایسی شاعرہ کی تخلیق ہیں جنھیں ایک مخصوص افسردہ رومانیت کی چادر میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ان نظموں میں حقیقت سے آنکھ ملانے اور اس کا سامنے کرنے کی ایک ایسی قوی لہر نظر آتی ہے جو ان کی غزلوں میں اس سطح پر نظر نہیں آتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ نثری نظم کے تحت شامل پہلی نظم 'ندامت' میں ہی اپنے تخلیقی سرمایے کو رد کرتی نظر آتی ہیں۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

میری تمام نظموں کا انتساب اب تک صرف میرے اپنے نام رہا
اور میں خود کو محبت کی شاعرہ سمجھ کر

> ''اردو میں جب نثری نظم اور پروین شاکر کی نثری نظم کی گفتگو ہوتی ہے، سارا شگفتہ کا خیال غیر شعوری طور پر ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ پروین شاکر، سارا شگفتہ کو جس طرح محسوس کرتی ہیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ سارا شگفتہ نے جیسی زندگی بسر کی اور اپنی تخلیقی و شعری شخصیت کو جس طرح سے پیش کیا ہے اس کی الگ الگ تعبیرات کی جاتی رہی ہیں۔ ان تعبیرات سے اختلاف اور اتفاق کی راہیں تلاش کی کی جا سکتی ہیں لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ سارا شگفتہ کو ایک ایسے کردار کی صورت میں پیش کرنے کی زبانی اور تحریری روایت رہی ہے جس میں صداقت کے عناصر کم اور زیب داستان کے اجزا زیادہ رہے ہیں۔ پروین شاکر نے ان تمام حقائق، الزامات اور قصہ گوئی کو ایک خاص تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔''

خوش ہوتی رہی
میں نے کوڑے کے ڈھیر پر بلّی کی طرح چلتا ہوا بچہ نہیں دیکھا
میں نے اینٹ کا تکیہ بنا کر سوتا ہوا راج نہیں دیکھا
راج سے میرے ذہن میں
ہمیشہ راج ہنس آئے
اور بچوں سے تازہ گلاب
میں کیک کو روٹی کا متبادل سمجھتی رہی
میرے بچے
میرے راج
ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا!''[1]

یہ اعتراف جرم اور ندامت صرف پروین شاکر سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا اطلاق ان تمام تخلیق کاروں پر ہوتا ہے جو اپنے محدود دائرے اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر، باہر کی دنیا سے الگ اور بے نیاز ہو کر اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ یہ نظم شاعری اور انسانیت کے دو مختلف اور متضاد پہلوؤں کو پیش کرتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظم پر ترقی پسند فکر غالب ہے اور اس میں کوئی ایسی انوکھی بات نہیں کہ اسے پروین شاکر کے ساتھ ہی مخصوص کر کے دیکھا جائے، لیکن جب ہم پروین شاکر کی پوری شعری و ادبی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ نظم تخلیقی تجربے اور تخیل سے زیادہ ان کی آپ بیتی اور خود احتسابی معلوم ہوتی ہے۔ ایک بیدار ذہن اور زندہ شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے اعمال و افکار کا خود بھی محاسبہ کرے۔ اس سیاق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروین شاکر کی نظموں میں ماورائیت کے ساتھ ساتھ زندگی بے رحم حقیقت اور عصری حسیت کا اظہار فنی تقاضوں کے ساتھ ہوا ہے۔

عصری حسیت، ماورائیت، حقیقت نگاری اور زندگی کی بے رحم صداقت جیسی اصطلاحیں آج پرانی معلوم ہو سکتی ہیں، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شعر و ادب کے سیاق میں اب ان کی معنویت کم ہو چکی ہے اور یہ تنقیدی اصطلاحات پامال ہو کر کلیشے کی صورت اختیار کر چکی ہیں، لیکن تخلیق اور فن پارے کی افہام و تفہیم کے عمل میں ہمیشہ تازہ اور جدید اصطلاحیں وضع کرنا ممکن نہیں ہوتا اور بعض اوقات مروجہ اصطلاحات بھی کارآمد ہو سکتی ہیں اور ان کا استعمال زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ تنقیدی اصطلاحات کے سلسلے میں یہ ایک دلچسپ مشاہدہ ہے کہ یہ بہت جلد قدیم اور روایتی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ایک مخصوص وقت میں ایک اصطلاح اس طرح گردش کرنے لگتی ہے کہ اس کے بغیر ادب کی تعبیر و تفہیم کوئی بھی کوشش ناقص لگتی ہے لیکن تھوڑے وقت کے بعد وہ اصطلاح اس طرح گم ہو جاتی ہے گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ اس کے برخلاف شعر اور ادب یا تخلیق ہر زمانے میں اپنی قوت اور آب و تاب برقرار رکھتی ہے۔ پروین شاکر کی نظمیں کیوں آج بھی تازہ اور بامعنی معلوم ہوتی ہیں، اس پہلو پر غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ دنیا میں بہت ساری انقلابی تبدیلیوں کے باوجود بعض مسائل اور موضوعات آج بھی اسی طرح حل طلب ہیں جیسے پہلے تھے۔ پروین شاکر کے شعری مجموعہ 'کفِ آئینہ' سے ایک نظم ملاحظہ کیجیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ کیا یہ نظم کبھی پرانی ہو سکتی ہے:

''ان دنوں
میری اپنے آپ سے بول چال بند ہے!
میرے اندر ایک بانجھ غصہ
پھنکارتا رہتا ہے
نہ مجھے ڈستا ہے
نہ میرے گرد اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہے
نینوا کی سرزمین
ایک بار پھر سرخ ہے
فرات کے پانی پر
ابن زیاد کے طرف داروں کا ایک بار پھر قبضہ ہے
زمین اور آسمان
ایک بار پھر ششماہے کا لہو
وصول کرنے سے انکاری ہیں
اور میرے چہرے پر اب مزید لہو کی جگہ نہیں!
فاتح فوج روشنی اور آگ کے فرق کو نہیں سمجھتی!
صحرا کی رات کاٹنے کے لیے انھیں الاؤ کی ضرورت تھی
سو انھوں نے میرے کتب خانے جلا دیے!
لیکن میں احتجاج بھی نہیں کر سکتی
میرے بالوں میں سرخ اسکارف بندھا ہے
اور میرے گلاس میں کوکا کولا ہنس رہا ہے
میرے سامنے ڈالر کی ہڈی پڑی ہوئی ہے!''[2]

اس نظم کو ابتدا تا انتہا پڑھیے یا انتہا تا ابتدا، اس کے تاثر میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوگی۔ لفظوں کی ترتیب اور جذبے کا وفور جس مدوجزر کے ساتھ ذہن میں نمودار ہوتا ہے اسے اسی روانی اور بہاؤ کے ساتھ پیش کرنا شاعرانہ قدرت کا ثبوت ہے۔ پروین شاکر نے اپنی نظموں میں جذبے کی شدت کو اس کے وفور کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں موضوع لفظ اور پیش کش کو متاثر بھی کرتا ہے اور ترسیل میں ناکامی بھی نہیں ہوتی۔ یہ عام سی بات ہے کہ انسان لالچ یا خوش فہمی میں اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا ہے اور جب اسے نقصان کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اپنے آپ سے ناراض ہو کر اندر ہی اندر کڑھتا ہے اور اپنا خون جلاتا ہے۔ یہ نظم اسی کیفیت سے عبارت ہے۔ متکلم کو احساس ہے کہ اس تباہی اور بربادی میں اُسی کا کردار ہے اور تباہ ہونے میں اس کی مرضی یا لالچ شامل ہے۔ نظم میں 'بانجھ غصہ' کی ترکیب خوب ہے۔ اس کی خوبی اور خاصیت کا تذکرہ بھی یہاں موجود ہے۔ بانجھ پن خواہ اس کی نوعیت جیسی بھی ہو وہ خوف زدہ ہی کرتا ہے اور یہ خوف ہمہ وقت اس کے ساتھ لاحق رہتا ہے۔ پروین شاکر نے جب یہ نظم کہی تھی اس وقت کے حالات اور واقعات سے کم و بیش سبھی واقف ہیں لیکن موجودہ حالت نظم میں مذکور صورت حال سے بہت مختلف نہیں ہے۔ ہماری شعری اور تہذیبی روایت میں نینوا، فرات اور کربلا مظالم کی جس داستان سے عبارت ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ زمین کو مقدس انسانی لہو سے سرخ کر دینا، عورت، بوڑھے اور بچے تک کو پانی سے محروم کر دینا اور تشنہ لب انسانیت کو تیر کا شکار بنانا، ایسے انسانیت سوز واقعات ہیں کہ جن کا تہذیبی زندگی میں تصور محض بھی لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔ پروین شاکر نے نظم میں اس تاریخی واقعے سے استفادہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آج بھی صورت حال کچھ مختلف نہیں۔ فاتح، غاصب اور جابر کے لیے آج بھی روشنی اور آگ میں فرق محسوس کرنا مشکل ہے۔ وہ روشنی کے لیے بستیاں جلانے سے دریغ نہیں کرتا۔ یہاں شاعرہ نے ایک لطیف نکتہ پیش کیا ہے جس کی طرف ہماری نگاہ کم ہو جاتی

ہے۔ یہ تین مصرعے پھر سے پڑھیے:

''فاتح فوج روشنی اور آگ کے فرق کو نہیں سمجھتی!
صحرا کی رات کاٹنے کے لیے انھیں الاؤ کی ضرورت تھی
سو انھوں نے میرے کتب خانے جلا دیے!''

روشنی اور آگ میں جو نسبت ہے وہ ہم جانتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ صحرا کی رات کاٹنے کے لیے گھاس پھوس اور خس و خاشاک کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ الاؤ جلا کر حرارت حاصل کی جاسکے اور اس کی روشنی میں رات گزاری جاسکے لیکن چونکہ فاتح فوج کو معلوم ہی نہیں ہے کہ روشنی اور حرارت کا حصول کتاب کے مطالعے سے بھی ممکن ہے۔ وہ صرف اس مادی آگ سے واقف ہے جس میں جلانے کی قوت ہے اور ایک خاص وقت کے بعد وہ روشنی یا آگ، تاریکی اور راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کتب خانے میں موجود کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا تو عین ممکن ہے کہ مادی آگ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی یا اسے ادراک ہو جاتا کہ آگ اور روشنی میں کیا فرق ہے۔

نظم کی آخری تین سطروں میں یہ کھلتا ہے کہ متکلم کے اندر بانجھ غصہ کیوں پھنکار رہا ہے، جو نہ اسے ڈستا ہے اور نہ اپنی گرفت ڈھیلی کرتا ہے۔ احتجاج غصے کا اظہار ہے لیکن جب انسان احتجاج نہیں کر پاتا تو اس کا غصہ اندر ہی جگہ بنا لیتا ہے۔ یہاں احتجاج نہ کرنے کی وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ لالچ، مفاد، تن آسانی، آسودگی اور بے حسی انسان کو اس کے جائز حقوق سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ پروین شاکر کی یہ نظم اپنے سیاق اول سے ماورا ہو کر ہر، اس ماحول اور صورت حال کے لیے بامعنی قرار دی جاسکتی ہے جہاں ذاتی مفاد اور آسودگی کے عوض اجتماعی نقصان پر آمادگی کا میلان ہو۔ اسی موضوع سے متعلق قدرے مختلف نظم 'ملبے پر لکھی گئی ایک نظم' ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

''دیمک ہماری نیو میں اتر چکی تھی
سو میں نے اسے ۔۔۔۔۔ چلانے کا اختیار دے دیا!
آج میں اپنے ملبے پر بیٹھی
سوچ رہی ہوں
ٹپکتی ہوئی چھت
اور گرتی ہوئی دیواروں نے
کتنے بھیڑیوں کو
مجھ سے دور رکھا تھا!'' [۳]

دیمک کے تعلق سے یہ مشہور ہے کہ وہ جہاں اتر جائے اس کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے، اسے تلاش کرنا اور اسے ختم کرنا ناممکن سا ہے کیونکہ اس کا وجود نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے صرف اس کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ وہ مکان یا گھر کی بنیاد کو نقصان تو پہنچاتا ہے لیکن مکینوں کے لیے بے ضرر ہی رہتا ہے۔ دیمک کے خوف سے گھر کو بلڈوز کر دینا کسی بھی طرح سے دانشمندی نہیں کہی جاسکتی۔ گھر میں رہتے ہوئے دیمک کی کھینچی گئی لکیروں کو دیکھ کر اسے گھر کے لیے خطرہ سمجھنا تو درست ہے لیکن گھر کی موجودگی بہت سی دوسری خارجی دشواریوں اور خطرات سے تحفظ کا احساس کراتی ہے۔ دیمک کے خوف سے گھر گرا دینے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ باہر اس معمولی خطرے سے کہیں زیادہ عظیم خطرات موجود ہیں پروین شاکر کی نظم استعاراتی حسن سے آراستہ ہے۔ یہاں نیو سے مراد خشت و خزف سے تعمیر شدہ مکان بھی ہے اور انسانی جسم بھی۔ تہذیب کی تاریخ بھی اور تمدن کا نشان بھی۔ نیو کسی کی بھی ہو سکتی لیکن نیو میں در آئی خرابی کے لیے پوری عمارت تو نہیں گرائی جاسکتی۔

اردو میں جب نثری نظم اور پروین شاکر کی نثری نظم کی گفتگو ہوتی ہے، سارا شگفتہ کا خیال غیر شعوری طور پر ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ پروین شاکر، سارا شگفتہ کو جس طرح محسوس کرتی ہیں وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ سارا شگفتہ نے جیسی زندگی بسر کی اور اپنی تخلیقی و شعری شخصیت کو جس طرح سے پیش کیا ہے اس کی الگ الگ تعبیرات کی جاتی رہی ہیں۔ ان تعبیرات سے اختلاف اور اتفاق کی راہیں تلاش کی کی جاسکتی ہیں لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ سارا شگفتہ کو ایک ایسے کردار کی صورت میں پیش کرنے کی زبانی اور تحریری روایت رہی ہے جس میں صداقت کے عناصر کم اور زیب داستان کے اجزا زیادہ رہے ہیں۔ پروین شاکر نے ان تمام حقائق، الزامات اور قصہ گوئی کو ایک خاص تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ اپنی نظم کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے سارا شگفتہ پر ایک نظم لکھی جس کا عنوان 'ٹماٹو کیچپ' رکھا۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے سارا شگفتہ اور ہمارے ادبی معاشرے کی حقیقی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے ساتھ ہی پروین شاکر کی نظم نگاری کا بھی معترف ہونا پڑتا ہے۔

جن لوگوں نے سارا شگفتہ کی شاعری اور زندگی کا مطالعہ کیا ہے یا احباب اور دوستوں کی محفلوں میں سارا کے تعلق سے گفتگو سنی ہے وہ اس نظم کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں لیکن جو لوگ سارا شگفتہ سے واقف نہیں وہ سارا کو محض ایک کردار سمجھ کر بھی اس نظم کی تفہیم کر سکتے ہیں۔ پروین شاکر کا یہ خیال کہ:

''ہمارے ہاں
شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے
ہر مرد خود کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے
اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا
اس لیے اس کا دشمن ہو جاتا ہے!''

کس قدر درست ہے اس کا اندازہ سبھی کو ہے۔ عوامی مشاعرے کی داد سے لے کر ذاتی نشستوں اور ادبی و شعری تعلقات تک کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جائے تو اس اعتراف کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا کہ پروین شاکر اپنے خیال میں بالکل درست ہیں۔ نثری نظم کا اختصاص یہی ہے کہ وہ ان موضوعات کو شاعری کے دائرے میں لے آتی ہے جن تک ہماری موزوں شاعری پہنچنے میں وزن و بحر اور ردیف و قافیہ کے حیلے تلاش کر لیتی ہے۔ پروین شاکر نے نثری نظم کو اس وقت اختیار کی جب وہ معتبر اور مستند شاعرہ کی حیثیت سے اپنا نام اور مقام دریافت کر چکی تھیں۔ اس کے باوجود ان کا نثری نظم کی طرف آنا نثری نظم کی قوت اور کشش کا ثبوت ہے۔

پروین شاکر کو نسائی لہجے کی شاعرہ قرار دے کر انھیں ایک خاص دائرے میں محدود کرنے کی شعوری کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن ان کے موضوعات اور پیش کش کو اس خاص دائرے میں قید کرنا آسان نہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے یہاں عورتوں کے مسائل زیادہ نظم ہوئے ہیں لیکن یہ مسائل محض عورتوں سے مخصوص نہیں ہیں۔ یہ مسائل کس کے پیدا کردہ ہیں اور پروین شاکر کا مخاطب کون ہے۔ ہمارا شعری و ادبی رویہ پدرسری سماج کے زیر نگیں رہا ہے۔ ہماری تنقید بھی ایک زمانے تک مرد اساس سماج کے زیر اثر رہی ہے اور آج بھی وہ اس سے یکسر آزاد نہیں ہے۔ اس لیے پروین شاکر اور ان جیسی دیگر شاعرات کی تخلیقات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا۔ پروین شاکر کی تخلیقات میں کئی ایسی نظمیں شامل ہیں جن میں عورتوں کے مسائل نظم ہوئے ہیں لیکن انھیں تنقیدی مطالعہ کا حصہ نہیں بنایا گیا۔

پروین شاکر نے عورتوں کے مسائل پر جو نظمیں تخلیق کی ہیں ان میں ''ایک مشکل سوال، ایک سوشل ورکر خاتون کا مسئلہ'' اور ''پروین قادر آغا'' بطور خاص اہم ہیں۔ یہ درست ہے کہ پروین شاکر کی نظموں میں زیادہ تر عورتوں کے جذبات اور مسائل نظم ہوئے ہیں لیکن ان نظموں کا ایک اہم حصہ مزدوروں اور روزمرہ کے کاموں سے منسلک افراد کے مسائل اور مشکلات سے وابستہ ہے۔ ایسی نظموں میں ''ایک UDC کی ڈائری'' اور ''اسٹل ملز کا ایک خصوصی مزدور'' قابل توجہ ہیں۔ پہلے نظم 'اسٹل ملز کا ایک خصوصی مزدور' ملاحظہ کیجیے:

''کالا بھوت
جیسے کوئلے کے نطفے سے جنم لیا ہو
ایک جہنمی درجۂ حرارت پر رہتے ہوئے
اس کا کام
دہکتی بھٹی میں کوئلے جھونکتے رہنا تھا
اس کے بدلے
اس کو اجرت بھی زیادہ ملتی تھی[۴]

یہ نظم مجبوری اور زندگی کی تلخ حقیقت کو پیش کرتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور نان شبینہ کے حصول کے لیے اپنے روز و شب کو کس طرح جہنم بنالیتا ہے یا اسے دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کتنے انگاروں بھری راہ سے گزرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ شاید اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب انسان خود اس تجربے سے گزرے۔

جدید اردو شاعری میں مزدور، کلرک اور افسروں سے متعلق بہت سی تخلیقات ملتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر نظموں میں کم و بیش انھی باتوں کا اعادہ ہوتا ہے لیکن جذبات اور احساسات کی زبان بدل جاتی ہے۔ ان کی شدت اور وفور کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ پروین شاکر ایک کلرک کی ڈائری میں کلرک کی زندگی اور اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ اس کی موجودہ زندگی کی تلخیوں اور آزمائشوں کو بھی نظر میں رکھتی ہیں اور اس کی کسک کو نہ صرف محسوس کرتی ہیں بلکہ قاری کے اندر بھی اس کسک کو بیدار کردیتی ہیں۔ اس نظم میں کلرک کی زندگی، آفس اور دفتروں کی صورتحال اور منصبی درجہ بندی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ آج بھی دفتروں کی حالت پہلے سے مختلف نہیں ہوئی ہے۔ آفس میں کام کرنے والوں کے رویے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ شعر و ادب کا موضوع کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن اس کا مقصد انسان کی زندگی میں بہتری لانا اور اسے فکری قوت فراہم کرنا ہے۔

اس نظم کی قرأت سے محسوس ہوتا ہے کہ آرزو دم توڑ چکی ہے۔ خواہشات اب حسرت اور کسک بن کر زندہ ہیں لیکن جب ہم نظم کے آخری مصرعوں تک پہنچتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ تمام تر ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود بہتر مستقبل کی امید برقرار ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں شاعر یقین دلاتا ہے کہ زندگی میں مسرت کے لمحات آنے والے ہیں۔ اسے شاعری کا رجائی پہلو بھی کہا جاسکتا ہے۔ ذلت اور پامالی کے باوجود رجائیت کے عناصر بحال رکھنا انسانی زندگی کی ایسی قوت ہے جو اسے تازہ دم رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔

پروین شاکر کی شہرت اور مقبولیت جس رنگ کی غزلوں سے قائم ہے اس رنگ کی نظمیں بھی ان کے کلیات میں مل جاتی ہیں۔ نثری نظم میں انھوں نے اس رنگ سے شعوری طور پر گریز اختیار کیا ہے لیکن اس کے باوجود کچھ نظموں میں اس مخصوص رنگ کی جلوہ سامانی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم 'مجھے جان لینا چاہیے تھا' ہے جس میں افسردہ رومانیت اور پژمردہ احساس اپنی توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

''وہ مجھے اس وقت ملا
جب پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی
چیری کے درختوں پر اولین شگوفے پھوٹ رہے تھے
نوخیز خوشبو سے سارا باغ روشن تھا
بلبل نے بس ابھی چہکنا شروع کیا تھا
اپنے بازوؤں میں لیے
وہ مجھے پھولوں بھری وادی میں
گھومتا رہا
اب میں ٹوٹے ہوئے پتوں میں
اپنے آنسو جمع کر رہی ہوں
مجھے جان لینا چاہیے تھا
کہ اس کا اور میرا ساتھ
موسم بہار تک ہے!''[۵]

پروین شاکر کو خوشبو کی شاعرہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ وجہ تسمیہ غالباً ان کا شعری مجموعہ ہے لیکن انھوں نے رنگ اور خوشبو کو جس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے اور اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا ہے، اس کی مثال جدید اردو شاعری میں کم ہی ملتی ہے۔ آخر میں ان کی ایک نظم 'I'LL MISS YOU' پیش ہے جس سے پروین شاکر کا وہ رنگ اور آہنگ بھی عیاں ہے جو ان کی شاعری سے مخصوص کیا جاتا رہا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

''جانے سے پہلے
اس نے میرے آنچل سے ایک فقرہ باندھ دیا
'I'LL MISS YOU'
سارا سفر
خوشبو میں بسا رہا!''[۶]

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پروین شاکر نے نثری نظم کے فروغ اور اس کی تحریک کو تخلیقی اساس فراہم کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا گو کہ ان کی تخلیقات میں نثری نظمیں تعداد میں کم ہیں لیکن یہ نظمیں پروین شاکر کی شعری و تخلیقی شخصیت کے ایک ایسے زاویے کا اظہار کرتی ہیں جو ان کی غزلوں اور موزوں نظموں میں واضح نہیں ہے۔ اس لیے یہ نظمیں نہ صرف نثری نظم کی تاریخ میں اہم ہیں بلکہ پروین شاکر کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کے افہام و تفہیم میں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

حوالے

۱۔ پروین شاکر۔ انکار، نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، 2011، ص: 149
۲۔ پروین شاکر۔ کف آئینہ، نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، 2008، ص: 88-87
۳۔ پروین شاکر۔ انکار، نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، 2011، ص: 185
۴۔ پروین شاکر۔ انکار، نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، 2011، ص: 160
۵۔ پروین شاکر۔ انکار، نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، 2011، ص: 184-183
۶۔ پروین شاکر۔ انکار، نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، 2011، ص: 180

❑❑❑

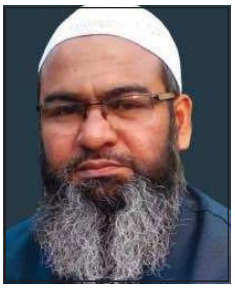

احمد نثار

ایڈیٹر: عالمی فلک، محمد علی روڈ، سٹی کالونی، دھنباد، جھارکھنڈ

8409242211

اخلاقی اقدار اور جدید استعاروں کا شاعر: بشیر بدر

> ”سب سے پہلی وجہ ان کی زبان کا سحر ہے۔ بشیر بدر نے غزل کو عام قاری کے قریب کرنے کے لیے زبان و بیان کو نہایت سادہ، شفاف اور دلکش رکھا۔ ان کے الفاظ میں ادبی لطافت بھی ہے اور عام فہم شیرینی بھی، جو سننے والے کو بلاتکلف متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار نہ صرف ادبی محفلوں میں بلکہ عام نشستوں اور سوشل میڈیا پر بھی گونجتے ہیں۔ دوسری نمایاں خصوصیت ان کا رومان اور انسانی جذبات کو بڑی سادگی سے بیان کرنے کا ہنر ہے۔ وہ عشق، جدائی، امید اور مایوسی جیسے احساسات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنی کہانی اس میں تلاش کر لیتا ہے۔ ان کے اشعار میں وہ درد اور نرمی ہے جو قاری کے دل تک براہِ راست پہنچتی ہے۔ تیسری اہم وجہ ان کا عصری شعور اور زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھنا ہے۔“

جب اردو شاعری کی بات ہوتی ہے تو چند نام خود بخود ذہن میں اُبھرتے ہیں، اور ان میں بشیر بدر کا نام محبت، تہذیب اور نرمی کے استعارے کے طور پر جگمگاتا ہے۔ وہ شاعر جس نے غزل کو صرف ایک صنفِ سخن نہیں، بلکہ دلوں کے درمیان خاموش ربط کی زبان بنا دیا۔ بشیر بدر صرف ایک شاعر نہیں، ایک عہد کی علامت ہیں، ایک ایسا عہد جو وقت کے گرداب میں گم ہوتا جا رہا ہے، لیکن جس کی خوشبو ان کے اشعار میں محفوظ ہے۔ بشیر بدر کا اصل نام سید محمد بشیر ہے۔ ان کی پیدائش 15 فروری 1935 کو فیض آباد، اتر پردیش (ہندوستان) میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی، جہاں سے انہوں نے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے بعد تعلیم و تدریس کو پیشہ بنایا اور مختلف جامعات میں اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ میرٹھ کالج میں سترہ سالوں تک ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ رہے۔ پہلی بیوی سے ان کی تین اولادیں ہیں، سید نصرت بدر، سید معصوم بدر اور بیٹی صبا بدر۔ ڈاکٹر راحت بدر ان کی دوسری منکوحہ ہیں ان سے ایک بیٹا سید طیب بدر ہے۔

ان کی زندگی میں ایک کربناک موڑ میرٹھ فسادات کے دوران آیا، جب ان کا مکان جلا دیا گیا اور ان کے بیش قیمت مسودات تباہ ہو گئے۔ بعد میں وہ بھوپال منتقل ہو گئے۔ انہیں پدم شری سمان (1999) اور ساہتیہ اکادمی اوارڈ (اردو) 1999 سے نوازا گیا۔ ان کے اشعار کی مقبولیت کا یہ عالم کہ وودھ بھارتی نے اپنے ایک ریڈیو پروگرام کا نام "اجالے اپنی یادوں کے" رکھا تھا۔ بشیر بدر کی شخصیت میں ایک عجیب کشش تھی۔ وہ جب مشاعروں میں کلام پڑھتے تھے تو سامعین صرف ان کے الفاظ نہیں، ان کی شخصیت کی تہذیبی خوشبو بھی محسوس کرتے تھے۔ ان کے لہجے میں دبے دبے دکھ، نرم احتجاج، اور مخلص جذبات کی جو آمیزش ہوتی تھی، وہ آج کے شور شرابے میں ایک نایاب نعمت لگتی ہے۔

ان کی سادہ، شستہ اور عام فہم زبان نے انہیں نہ صرف خواص کا شاعر بنایا بلکہ عوام کا دل بھی جیت لیا۔ ان کے اشعار سوشل میڈیا کی دنیا سے لے کر چائے خانوں کی گفتگو تک، ہر جگہ گونجتے ہیں۔ لیکن اس مقبولیت کے پیچھے جو شخصیت ہے، وہ کئی زخموں، کئی خوابوں، اور کئی ادھورے وعدوں سے بنی ہوئی ہے۔ فسادات، جلا ہوا مکان، ضائع شدہ مسودے، اور پچھتاووں کی دھند میں لپٹی ان کی زندگی، دراصل ایک کبھی نہ ختم ہونے والی غزل ہے۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی، وہ دراصل ایک گہری خامشی کا پردہ ہوتا تھا۔ بشیر بدر کی شخصیت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ شاعری صرف الفاظ کا کھیل نہیں، احساس کا آئینہ ہے۔ وہ ان معدودے چند شعرا میں سے ہیں جنہوں نے زندگی کو جیا بھی، جھیلا بھی، اور جلا بھی بخشی۔ ان کی شاعری میں جو "فاصلوں کا ادب" ہے، وہ محض دنیاوی فاصلے نہیں بلکہ رشتوں، وقت، اور تہذیب کے درمیان بڑھتی خلیج کا اظہار یہ ہے۔

یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلے سے ملا کرو

یہ مصرع صرف ایک تنبیہ نہیں، بلکہ بشیر بدر کی تہذیبی بصیرت کا بیان ہے۔

آج جب شاعری، مشاعروں اور میڈیا میں شور اور نمائشی پن کا غلبہ ہے، تو بشیر بدر جیسے شعرا کی شخصیت اور شاعری ایک خاموش شائستگی کی آخری مثال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اشعار میں جو "تمہید گفتگو" ہے، وہ ہماری کھردری زبان، بکھرے احساسات، اور الجھے رشتوں کو سلجھاتی ہے۔

بشیر بدر کی شخصیت پر لکھنا، دراصل ایک تہذیب کے رخصت ہونے پر آنکھ نم کرنا ہے۔ وہ آج بھی ہمارے درمیان زندہ ہیں، لیکن ان کی شاعری ہمیں آنے والے زمانوں کے لیے ادب، اخلاق اور احساس کی روشنی دے رہی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اردو ادب میں "سب کچھ ختم نہیں ہوا"، تو اس کا ایک سبب بشیر بدر جیسے لوگ ہیں، جو نہ صرف زندہ ہیں، بلکہ زندگی کے جمالیاتی معنی کی حفاظت بھی کر رہے ہیں۔

بشیر بدر اردو غزل کے اُن منفرد شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے رومان، احساس، تہذیبی دکھ اور جمالیاتی شعور کو ایک دلکش اور سادہ پیرایہ؟ اظہار دیا۔ ان کا شمار بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو غزل کو نئی جمالیات، نئی زبان اور نیا تجربہ دینے والے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل نہ صرف روایتی حسن سے مزین ہے بلکہ عہدِ جدید کی روح سے بھی ہم آہنگ ہے۔ بشیر بدر کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے غزل کو عوامی سطح پر مقبول بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ "اکائی" "امیج" "آس" "آمد" ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آئے جنہیں زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ "آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ" اور "بیسویں صدی میں غزل" ان کی غزلوں کی تنقید پر لکھی گئی بہترین کتابیں ہیں۔

بشیر بدر کی غزل میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے سادگی میں گہرائی، اور روزمرہ زبان میں غیر معمولی فکری لطافت۔ وہ نہ فلسفے کے بھاری بھرکم جال میں قاری کو الجھاتے ہیں، نہ کلاسیکی تلمیحات سے بوجھ ڈالتے ہیں۔ اس کے برعکس، وہ دل کے نرم جذبات کو بڑی خوبصورتی اور نرمی سے پیش کرتے ہیں۔

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

*

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے، ذرا فاصلے سے ملا کرو

*

ہم بھی دریا ہیں ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑیں گے راستہ ہو جائے گا

یہ اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ بشیر بدر عصری حساسیت اور تہذیبی تبدیلیوں کے شاعر شاعر ہیں۔ محبت اور رومان ان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے، لیکن وہ محبت کو صرف جذباتی وابستگی تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ اس کے سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ بشیر بدر کی غزلوں میں ہمیں بارہا ایک ٹوٹتی ہوئی تہذیب، اجڑتے رشتے، اور اکیلے پن کا احساس ملتا ہے۔ وہ نئی زندگی کے پیچ وخم کو بہت نرم لہجے میں بیان کرتے ہیں، جس میں نہ احتجاج ہے، نہ خطابت، بلکہ ایک نرماہٹ سے بھرا طنز ہے۔

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

بشیر بدر نے اردو اور ہندی کے امتزاج سے ایسی زبان پیدا کی جو عام قاری کے دل تک پہنچتی ہے۔ ان کے کئی اشعار ہندی بولنے والوں میں بھی یکساں مقبول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری مشاعروں، فلموں، نغموں اور عام گفتگو میں بھی جگہ پا گئی ہے۔

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

*

کچھ تو مجبوریاں رہیں ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

نقادوں کی اکثریت بشیر بدر کو جدید اردو غزل کا نمائندہ شاعر مانتی ہے۔ بشیر بدر نے اردو غزل کو ایک نئی عوامی زندگی بخشی ہے، جو نہ صرف کلاس روم میں پڑھی جاتی ہے بلکہ بازار میں، چائے خانوں میں، سوشل میڈیا پر بھی زندہ ہے۔ ان کی شاعری کو بعض تنقید نگاروں نے "زیادہ سادہ" کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی، لیکن وقت نے ثابت کیا کہ عوامی رسائی اور جمالیاتی تاثر کسی بھی شاعر کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

ان کے کئی اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

*

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

*

گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

*

میں ترے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے

بشیر بدر کے یہاں جو چیز اُنہیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے، وہ اُن کے ہاں استعاروں کا بھرپور اور تخلیقی استعمال ہے۔

مری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے
تمام جسم کے کپڑے اتار لیتی ہے

"کپڑے اتار لینا" ایک استعارہ ہے جس کے ذریعے داخلی حقیقت کو برہنہ کرنے کا تصور جھلکتا ہے۔ شاعر نے اپنی نظر کے اثر کو حد سے بڑھا کر بیان کیا ہے، تاکہ اس کی شدت اور اثر پذیری واضح ہو۔ یہاں بصارت اور مکالمہ دونوں کا امتزاج ایک جاندار تصویر پیدا کرتا ہے۔ یہ شعر روایتی غزل یا کلاسیکی انداز سے ہٹ کر جدید اردو شاعری کی جرائت، نفسیاتی تہہ داری اور علامتی اسلوب کو اپناتا ہے۔ جسمانی عریانی کا ذکر دراصل سماجی ونفسیاتی برہنگی کے لیے کیا گیا ہے، جو قاری کو چونکانے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

یہ شعر محض جسمانی منظر نگاری نہیں بلکہ ایک نفسیاتی اور علامتی بیان ہے کہ شاعر کی گہری کھوجتی ہوئی نگاہ مخاطب کی تمام نقابیں اور سماجی پردے ہٹا دیتی ہے، اور اس کی اصل حقیقت کو سامنے لے آتی ہے۔ اس میں جرائت، علامت اور داخلی بصیرت کا خوبصورت امتزاج ہے۔

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انسان کو محبت کی ضرورت ہے بہت

یہ شعر ایک نہایت بامعنی اور عصری حسیت رکھنے والا پیغام دیتا ہے۔

شاعر نے نفرت اور محبت کو مرکزی استعارے کے طور پر برتا ہے۔ یہ ایک سماجی و انسانی پیغام ہے کہ موجودہ دور میں نفرتوں کو ختم کرنا اور محبت کو فروغ دینا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو'' ایک علامتی اور تصویری پیکر

(Imagery) ہے، جو نفرت کو کسی مادی شے کی طرح بند کرنے اور مٹی تلے دفن کرنے کا عمل ظاہر کرتا ہے۔ "سات" کا عدد محض گنتی کے لیے نہیں بلکہ تکمیل اور تاکید کے لیے آیا ہے، گویا شاعر نے نفرت کو ختم کرنے کے لیے حد سے زیادہ احتیاط اور پوری قوت صرف کرنے کی تاکید کی ہے۔ عصری تناظر میں یہ شعر ہمارے موجودہ عالمی اور قومی حالات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سیاسی، مذہبی، اور سماجی تقسیم نے انسان کو انسان سے دور کر دیا ہے۔ شاعر اس رویے کو بدلنے کی تلقین کر رہا ہے۔ یہ شعر نہ صرف ایک اخلاقی نصیحت ہے بلکہ سماجی اصلاح کی دعوت بھی ہے۔ شاعر کی زبان سادہ مگر پُر اثر ہے، اور اس میں تخیل و علامت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ پیغام واضح، آفاقی اور ابدی ہے۔

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہئے انہیں کچھ ہنسی آگئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

یہ شعر جمالیاتی اور جذباتی تاثر دونوں اعتبار سے نہایت خوبصورت ہے، اور اس میں دو بنیادی عناصر نمایاں ہیں۔ تصویریت (Imagery) اور ڈرامائی موڑ (Dramatic Turn)۔ پہلا مصرع آنکھوں اور پلکوں کی ایسی تصویر کھینچتا ہے جو نہ صرف بصری تاثر رکھتی ہے بلکہ حسی و جذباتی اثر بھی پیدا کرتی ہے۔

"آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی" یہاں آنکھوں کا آنسوؤں سے بھرا ہونا اور پلکوں کا بوجھل و گھنا ہونا ایک دل گرفتہ کیفیت ظاہر کرتا ہے۔ جیسے جھیلیں بھی ہوں، نرم سائے بھی ہوں" یہ تشبیہات حسن کو فطرت کے پُرسکون اور گہرے مناظر سے جوڑتی ہیں۔ جھیلوں کی گہرائی اور نرم سایوں کا سکون ایک ساتھ مل کر آنکھوں میں اداسی اور دلکشی کا امتزاج پیدا کرتے ہیں۔ یہ مصرع قاری کو ایک بصری اور جذباتی تصویر میں لے جاتا ہے۔ دوسرا مصرع اچانک فضا بدل دیتا ہے "وہ تو کہئے انہیں کچھ ہنسی آگئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے۔ یہاں شاعر ایک استعاراتی منظر پیش کرتا ہے، گویا آنکھوں کی کشش اور کیفیت ایسی تھی کہ شاعر خود کو "ڈوبتا" محسوس کر رہا تھا، یہ ڈوبنا محبت و کشش میں محو ہونے کا استعارہ بھی ہے اور جذباتی گرفت میں آنے کا اشارہ بھی۔ مگر "ہنسی آجانا" اس سنجیدہ اور گمبھیر کیفیت کو توڑ دیتا ہے، اور شاعر اس "ڈوبنے" سے بچ نکلتا ہے۔ اس شعر کی سب سے بڑی فنی کامیابی یہ ہے کہ یہ دو مختلف کیفیات کو یکجا کرتا ہے، آنکھوں کو جھیل اور نرم سائے سے تشبیہ دینا۔ "ڈوبنا" جذبات میں کھو جانے یا محبت میں گرفتار ہونے کا استعارہ۔ مصرعوں کی ترکیب اور ربط ایسا ہے کہ قاری بہاؤ کے ساتھ چلتا ہے اور آخر میں ایک غیر متوقع موڑ کا لطف لیتا ہے۔ یہ شعر ایک نادر مثال ہے کہ کس طرح حسن کی تصویر، جذباتی گہرائی، اور ہلکی سی شوخی کو ایک مختصر پیرائے میں سمویا جا سکتا ہے۔ اس میں رومانی کشش کے ساتھ ایک لطیف مزاح کا پہلو بھی جھلکتا ہے، جو اسے صرف سنجیدہ یا صرف مزاحیہ نہیں، بلکہ دونوں کا حسین امتزاج بناتا ہے۔

بشیر بدر کے استعارے محض آرائشی نہیں ہوتے بلکہ وہ جذبے اور خیال کی ایسی گاڑھی تہہ پیدا کرتے ہیں جو غزل کے معنی کو وسعت اور گہرائی عطا کرتی ہے۔ ان کے اشعار میں روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزیں، انسانی تعلقات کے پیچیدہ رنگ، اور وقت کے نشیب و فراز استعاروں کے ذریعے ایک علامتی کائنات میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ استعارے قاری کے ذہن میں صرف ایک تصویر نہیں بناتے بلکہ احساسات کا ایک سلسلہ جگا دیتے ہیں، گویا لفظ، منظر اور جذبہ یکجا ہو کر ایک ہم آہنگ تجربہ تخلیق کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر، وہ چاند، بارش، چراغ یا ہوا جیسی اشیا کو صرف فطری منظر کشی کے لیے نہیں برتتے بلکہ ان میں انسانی تنہائی، محبت کی لَو، یا جدائی کی کسک سمو دیتے ہیں۔ ان کا فن یہ ہے کہ ایک عام اور مانوس شے کو غیر معمولی معنویت دے دیتے ہیں۔ یہی فنکارانہ مہارت اُن کے استعاروں کو دیرپا اور قاری کے دل میں نقش کر دیتی ہے۔ بشیر بدر کی شاعری میں استعاروں کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ پیچیدگی کے باوجود سادگی سے سمجھ آجاتے ہیں۔ یہ سادگی فریب دہ ہے، کیونکہ جتنا زیادہ غور کیا جائے، اتنی ہی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری عام قاری کو بھی متاثر کرتی ہے اور سنجیدہ قاری کو بھی طویل فکری سفر پر لے جاتی ہے۔ آج کے دور میں جب غزل میں سطحیت اور براہِ راست اظہار کا رجحان بڑھ رہا ہے، بشیر بدر کے استعارے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ شعر کی اصل قوت لفظ اور معنی کے بیچ پوشیدہ فاصلوں میں ہے۔ اُن کے ہاں یہ فاصلہ کبھی دھندلا سا منظر بناتا ہے، کبھی آئینہ دکھاتا ہے، اور کبھی دل میں ایک سوال چھوڑ جاتا ہے جو برسوں ساتھ رہتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ بشیر بدر کے ہاں استعارہ محض ایک شعری تکنیک نہیں بلکہ احساس اور فکر کو بیک وقت سنبھالنے کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ ان کی شاعری کو نہ صرف خوبصورت بلکہ دیرپا اور معنوی طور پر بھرپور بناتا ہے، اور یہی ان کے فن کا اصل کمال ہے۔ بشیر بدر کے اشعار کتابوں کی حدود سے نکل کر محفلوں، گلی کوچوں اور روزمرہ کی گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔ بشیر بدر کی شاعری نے جس مقبولیت کا سفر طے کیا، اس کے پس پشت کئی نمایاں عوامل کارفرما ہیں۔

سب سے پہلی وجہ ان کی زبان کا سحر ہے۔ بشیر بدر نے غزل کو عام قاری کے قریب کرنے کے لیے زبان و بیان کو نہایت سادہ، شفاف اور دلکش رکھا۔ ان کے الفاظ میں ادبی لطافت بھی ہے اور عام فہم شیرینی بھی، جو سننے والے کو بلا تکلف متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار نہ صرف ادبی محفلوں میں بلکہ عام نشستوں اور سوشل میڈیا پر بھی گونجتے ہیں۔ دوسری نمایاں خصوصیت ان کا رومان اور انسانی جذبات کو بڑی سادگی سے بیان کرنے کا ہنر ہے۔ وہ عشق، جدائی، امید اور مایوسی جیسے احساسات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنی کہانی اس میں تلاش کر لیتا ہے۔ ان کے اشعار میں وہ درد اور نرمی ہے جو قاری کے دل تک براہِ راست پہنچتی ہے۔ تیسری اہم وجہ ان کا عصری شعور اور زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھنا ہے۔ بشیر بدر نے صرف روایتی غزل گوئی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے دور کے بدلتے ہوئے سماجی اور نفسیاتی منظرنامے کو بھی اپنی شاعری میں سمویا۔ اس توازن نے ان کی شاعری کو کلاسیکی وقار اور جدید احساس دونوں سے مالا مال کیا۔

میڈیا اور مشاعروں میں ان کی بھرپور موجودگی بھی مقبولیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان کی ترنم بھری آواز، برجستہ جملے اور خوش گفتاری نے سامعین کو مسحور کیا۔ یوں ان کے اشعار صرف کتابوں میں نہیں رہے بلکہ براہِ راست لوگوں کے دلوں میں اتر گئے۔ مختصر یہ کہ بشیر بدر کی مقبولیت کا راز ان کی سادہ مگر گہری زبان، جذبات کی سچی عکاسی، عصری شعور اور ذاتی شخصیت کی کشش میں پوشیدہ ہے۔ بشیر بدر ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کو دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔ ان کی شاعری میں نرمی ہے، تہذیب ہے، جدت ہے، اور دل کی گہرائیوں سے جڑا ہوا سچ ہے۔ انہوں نے اردو غزل کو ایک نئی شناخت دی، جس میں نہ صرف روایت کی خوشبو ہے بلکہ زمانے کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔ بشیر بدر کی شاعری نہ صرف اردو ادب کا اثاثہ ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے محبت، تہذیب، اور انسان دوستی کا سبق بھی۔

❑❑❑

ڈاکٹر صائمہ ثمرین
پروجیکٹ اسسٹنٹ، نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان، جھولا، نئی دہلی
8448556386

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں نسائی جہتیں

نظم نگار شاعرات میں فہمیدہ ریاض کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ان کی ولادت 28 جولائی 1945ء کو میرٹھ میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد فہمیدہ ریاض کا قیام پاکستان میں رہا لیکن کچھ دنوں کے بعد ان کے احتجاجی رویے کی بنا پر انھیں پاکستان حکومت نے معزول کر دیا اور وہ ہندوستان میں قیام پذیر ہوئیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد یہاں پر سماجی اور سیاسی سطح پر افراتفری کی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ جس میں عورتوں کے خلاف بہت زیادہ جبر و استبداد کیا جاتا تھا اسی کے چلتے وہاں ''تحریک نسواں'' کو فروغ ملا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اچھی خاصی شاعرات کی تعداد نمودار ہوئی۔ ان شاعرات میں ایک نام فہمیدہ ریاض کا بھی ہے۔ انھوں نے عورت کی آزادی کے لیے مروجہ فرسودہ روایات و اقدار سے بغاوت کیا اور اس کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی شاعری کا آغاز 1960ء کے بعد کیا۔ ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیات روایت سے بغاوت اور احتجاج ہے۔ جس بے باکی سے انھوں نے اپنے عہد کے اہم مسائل جیسے عورتوں کے احساسات و جذبات اور ان کی نفسیاتی الجھن کو پیش کیا ہے اس کی مثال اس عہد کی دوسری شاعرات کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے اس احتجاجی رویے کی وجہ سے انھیں شدید مخالفت اور تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے انھیں ترک وطن کر کے ہندوستان میں پناہ لینی پڑی۔ ترک وطن ہونے کے باوجود بھی فہمیدہ ریاض کی ثابت قدمی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ انھوں نے سماجی اور سیاسی بے راہ روی اور عورتوں کے ساتھ ہو رہے ظلم و ستم کے خلاف آوازیں بلند کیں۔ یہاں پر ایک بات عرض کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ فہمیدہ ریاض کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کو جبلی ضرورت کے طور پر اپنی بعض نظموں میں پیش کیا ہے۔ ان سے پہلے کسی بھی شاعرات نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت نہ کی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان لوگوں کو سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی شاعری کو جنس پرستی کا نام دے کر نظر انداز کیا گیا۔

فہمیدہ ریاض نے اپنی نظموں میں سماجی و سیاسی مسائل کے علاوہ سائنسی، مناظر فطرت، انسان دوستی اور جنسی مسائل کو موضوع سخن بنایا ہے۔ لیکن ان کی نظموں کا اہم موضوع ایک عورت اور اس کے متعلق مسائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں عورت اور ان کے مسائل کے متعلق نظمیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''پتھر کی زبان'' 1967ء میں منظر عام پر آیا۔ اس وقت ان کی عمر محض 19 سال کی تھی۔ عمر کی اس منزل میں ایک نوعمر لڑکی کے جذبات و احساسات کیا ہوتے ہیں اس کو سمجھنے کے لیے فہمیدہ ریاض کی نظمیں بہترین وسیلہ ہیں۔ اس مجموعہ میں کم سن لڑکیوں کے جذبات و احساسات کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مجموعہ میں جذبات و احساسات کے علاوہ اپنے خوابوں کی ایک خوبصورت دنیا تعمیر کرتی نظر آتی ہیں۔ اس مجموعہ کے اہم موضوعات تنہائی کا احساس، وصل، جذبۂ عشق وغیرہ کافی اہم ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی فکری تشکیل کو سمجھنے کے لیے یہ مجموعہ اہمیت کا حامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ میری سوچ کی انجان کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے
اپنی مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں چھپی
سر جھکائے ہوئے کترائے نکل جاتی ہے

> ''فہمیدہ ریاض کی نظمیں فنی اعتبار سے بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔ انھوں نے نظموں کے علاوہ کچھ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن ان کی مقبولیت ان کی نظموں کی وجہ سے ہے۔ دو نظموں کو چھوڑ کر باقی سبھی نظمیں آزاد نظم کے فارم میں ہیں اور وہ دو نظمیں نثری پیرائے میں لکھی گئی ہیں۔ آزاد نظم میں انھوں نے مختصر نظم کی ہیئت کو زیادہ برتا ہے۔ جس میں غنائیت اور موسیقی اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی نظموں کو مختلف علامتوں اور اشاروں کے وسیلے سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فہمیدہ ریاض کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی علامتیں بہت ہی فطری اور حقیقی ہوتی ہیں۔ مثلاً شام کی علامتوں کو انھوں نے مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔''

مزیدان کی فکری تشکیل کو سمجھنے کے لیے ان کی نظم ''آخری آدمی'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تھرتھراتے لبوں سے دے کے دعا
عمر بھر کے لیے وداع کیا
مگر اب تک یہ سوچ ہے دل میں
ان سے اک بار اور مل آئیں

''بدن دریدہ'' فہمیدہ ریاض کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعہ میں احتجاج اور بغاوت کی لہر بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے اس مجموعہ میں عورتوں کے ساتھ جنس کے نام پر کی جانے والی ناانصافیوں کی سخت تنقید کی ہے۔ فہمیدہ ریاض کا خیال تھا کہ عورت اپنے آپ میں مکمل وجود رکھتی ہے۔ جو مردوں کے بنائے ہوئے سماج سے لڑسکتی ہے جس میں عورت کی انفرادیت سے انکار کیا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے عورتوں کے احساسات و جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اور اس بات کی بھی سخت مخالفت کی ہے کہ عورتیں مذہب، سماج، قانون اور اخلاقی قدروں کے نام پر کیوں ظلم وستم کا شکار ہو رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فہمیدہ ریاض نے معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی بیشتر نظموں میں جیسے ''میرا اور تمہارا بیچ''، ''باکرہ''، ''کب تک''، ''وہ ایک زن ناپاک ہے'' اور ''ایک عورت کی ہنسی'' وغیرہ میں عورتوں کے سماجی، اخلاقی اقدار اور عورتوں پر ہو رہے بے جا ظلم وستم کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی ایک اور نظم ''شہر والو سنو'' جو اس عہد کی سیاسی، سماجی صورت حال کا ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ عورت کے بارے میں مردانہ رویہ یہ ہے کہ اس کا انکار بھی اقرار ہے۔ فلسفیانہ طور پر یہ مظہریت کی نفی ہے۔ لیکن فہمیدہ ریاض کا جواب بے حد لچپ اور دوٹوک ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

جو میرے لب پہ ہے شاید وہی صداقت ہے
جو میرے دل میں ہے اس حرفِ رائیگاں پہ نہ جا

''دھوپ'' 1975ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی بیشتر نظموں میں احتجاج اور بغاوت کے تئیں نرمی اور سنجیدگی کا احساس دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس مجموعہ میں فہمیدہ مکمل عورت کی حیثیت سے نظر آتی ہیں۔ اس مجموعہ میں کچھ نظمیں بہت ہی خوبصورت ہیں جیسے ''ایک لڑکی سے''، ''لوری''، ''بہاؤ'' وغیرہ۔ یہ نظمیں تعلیم یافتہ عورت کی حسیت کے اظہار کا بہترین نمونہ ہیں۔ آج ہمارے سماج میں عورت اتنی بندشوں اور پابندیوں کے درمیان رہتی ہے جس کے سبب اس کا تعلق باہر کی دنیا سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت توہم پرستی اور قدامت پرستی کی شکار ہو رہی ہیں۔ ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ اسیر شہزادی!
جبر وخود کی دختر
واہمو کی پروردہ
مصلحت سے ہم بستر
ضعف و یاس کی مادر

فہمیدہ ریاض کو اس بات کا یقین تھا کہ ہمارے سماج کی عورتیں جب ان بندشوں اور روایتی رسموں سے آزاد ہو جائیں گی تو ایک نیا معاشرہ بنانے اور اپنے وجود کے تشخص کی تعمیر میں اہم رول ادا کریں گی۔ درج بالا نظم کے آخر میں وہ عورتوں کے اندر آزادی کا جذبہ بیدار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نظم کے اختتام کے چند مصرعے ملاحظہ ہو:

تو ہے وہ زن زنداں
جس کا جسم شعلہ ہے
جس کی روح آہن ہے
جس کا نطق گویا ہے
بازوؤں میں قوت ہے
انگلیوں میں صناعی
ولولوں میں بے باکی
لذتوں کی شیدائی
عشق آشنا عورت
وصل آشنا عورت
مادر خدا وندی
آدمی کی محبوبہ

فہمیدہ کی ایک اور نظم ''ایک بہت ہی سیدھی بات'' ہے جو ان کے مجموعہ ''دھوپ'' میں شامل ہے۔ اس نظم میں فہمیدہ نے اس بات کو موضوع بنایا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں بہت ہی شرمیلی ہوتی ہیں۔ فہمیدہ اس بات کی نفی کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ صرف اور صرف مردوں کا روایتی تصور ہے جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چوں کہ آج بھی ہمارے سماج میں عورتیں مردوں کے بنائے ہوئے قانون میں رہتی ہیں اور حالات کے اثر قبول کرتے ہوئے اس سے مطمئن ہو جاتی ہیں۔ لیکن فہمیدہ ریاض کا یہ خیال ہے کہ حقیقت دراصل اس کے برخلاف ہے کیوں کہ آج بھی ہمارے معاشرے کی بہت ساری عورتیں ایسی ہیں جو مردوں کے بنائے قانون سے مطمئن نہیں ہیں لیکن سماجی پابندیوں اور کچھ دوسری پریشانیوں کی وجہ سے وہ اس بات کا اظہار نہیں کر پاتی ہیں۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے اپنی ایک نظم ''ایک بہت ہی سیدھی بات'' میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

۔۔۔ناری کو شرمیلا کہنے والوں کو شرمائے
اور سوچے اپنے کوکھ میں پلنے والے جیو کا نام
پر دیوانی ابھیلاشا کے ہاتھ پڑی زنجیر
جس سے بندھی تقدیر
جس میں الجھے دو محلے، غالیچے وربان
غالیچوں کے ساتھ بھلا ناری کب تک سوئے گی
بے شک رات کی تنہائی میں چھپ چھپ کر روئے گی

فہمیدہ ریاض کی نظموں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عورتوں کے تجربات اور احساسات و جذبات کو انتہائی بے باکانہ انداز میں پیش کر کے اس کو زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ ''پتھر کی زبان'' میں انھوں نے ایک نوعمر لڑکی کے جذبات و احساسات کو پیش کیا ہے تو وہیں ''بدن دریدہ''، ''دھوپ'' اور ''آدمی کی زندگی'' وغیرہ نظموں میں وہ ایک لڑکی سے عورت، عورت سے ایک ماں بننے تک کے سفر کو دلکش اور خوبصورت تجربات کو پیش کرتی ہیں۔ رام لعل رقم طراز ہیں:

لڑکی سے عورت اور عورت سے ماں بننے تک کے سفر میں جو تصویریں ''بدن دریدہ'' اور ''دھوپ'' کے زاویوں اور کرنوں میں ڈھلتی چلی جاتی ہیں وہ ذاتی، دھارداراور ست رنگی ہیں۔ ذاتی اس حوالے سے کہ اس سے پہلے ایسی باتیں ہم نے کسی عورت کے زبان سے نہیں سنیں۔ دھارداراس حوالے سے کہ ایسا بے باک لہجہ، ایسے بے باک خیالات کے جلو میں اس سے پہلے کسی نے اختیار نہیں کیا اور ست رنگی اس حوالے سے کہ فہمیدہ نے ہر تجربہ کو ہری بھری راتوں، ساون کی بارشوں اور بہار کے حسن کی لذتوں اور منظروں کی گود میں پال کر جوان کیا ہے۔

رام لعل نے فہمیدہ ریاض کی شاعری کے متعلق بالکل بجا اور حق کہا ہے کیوں کہ اس سلسلے کی بہت نظمیں ہیں جن کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حسین جھرنے پر ڈول رہی ہے
تیری میری جان کی کایا
اس جھرنے پر پتہ پتہ
بہکتا جائے
کہتا جائے
ہاتھ نہ آئے
(ابر بہار)

یہیں تو کہیں پر
تمہارے لبوں نے
میرے سرد ہونٹوں سے برفیلے ذرے چنے تھے
ہٹا کر ردا برف کی گھاس سے لہرا رہی ہے
ہری پتیوں کی گھنی ٹہنیوں میں
ہوا جب چلے تو
گئے موسموں سے گزرتی
ہماری ہنسی گونجتی ہے
(برف باری کی رُت ''پتھر کی زبان)

فہمیدہ ریاض کی نظموں میں جہاں عورتوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ملتی ہے تو وہیں دوسری طرف ان کی نظموں میں سیاسی شعور کا بھی اظہار ملتا ہے۔ عورتوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاست اور غیر جمہوری نظام کے خلاف احتجاج کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے وہ ''بدن دریدہ'' کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

کارگاہ ہستی میں کس حساس ذی روح پر وہ مقام نہیں آیا ہوگا جب اس نے خود کو مقتل کے دروازے پر نہ پایا ہو۔ جب اسے اپنے وجود کی قیمت نقد جان سے نہ بچانی پڑی ہو۔ لیکن جب جان سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جھکا کے کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنادیں۔ آخری سانس تک جنگ کریں۔ سو میں نے بھی اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں پائی۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں ایک رجز ہیں۔ جسے بلند آواز میں پڑھتی ہوئی میں اپنے مقتل سے گزری۔

انسانیت اور انسان دوستی فہمیدہ ریاض کی نظموں کے اہم موضوعات ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے جذبات واحساسات، سماجی اور سیاسی زندگی کے علاوہ انسانیت، انسان دوستی اور امن پرستی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ فہمیدہ ریاض انسانیت اور بھائی چارگی کے جذبے کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے جنگ وجدل کے بجائے امن کا پیغام دیتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری انسان دوستی اور بھائی چارگی کا پیغام دیتی ہے۔ انسان دوستی کے لیے ضروری ہے کہ سماج کے دانش ور اپنے اپنے طور پر نمایاں کارنامہ انجام دیں۔ اس سلسلے میں فہمیدہ ریاض پیش پیش نظر آتی ہیں۔ ان کی ایک نظم ''تحسین'' ہے جس میں انسان دوستی اور بھائی چارگی کو بڑھاوا دیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لاریب لسان الغیب ہو تم
تحسین! کہ جو کھینچا منظر
تم کیسے جگ میں جیتے تھے سجن!
پلٹا ہے وہی پر تمہرے بن
وہی فتنہ وشر وہی روز بتر
وہی طوق طلا وہی گردن خر
ابلہ کے لیے وہی شربت گل
دانا کی روزی خون جگر

فہمیدہ ریاض کی نظمیں فنی اعتبار سے بھی کم اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔ انھوں نے نظموں کے علاوہ کچھ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن ان کی مقبولیت ان کی نظموں کی وجہ سے ہے۔ دو نظموں کو چھوڑ کر باقی سبھی نظمیں آزاد نظم کے فارم میں ہیں اور وہ دو نظمیں نثری پیرائے میں لکھی گئی ہیں۔ آزاد نظم میں انھوں نے مختصر نظم کی ہیئت کو زیادہ برتا ہے۔ جس میں غنائیت اور موسیقی اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی نظموں کو مختلف علامتوں اور اشاروں کے وسیلے سے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فہمیدہ ریاض کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی علامتیں بہت ہی فطری اور حقیقی ہوتی ہیں۔ مثلاً شام کی علامتوں کو انھوں نے مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شام پھیلے دھندلکے میں
جانے کب سے کھڑے ہوئے ہیں ہم
سارے دن کی تھکن سے پژمردہ
کاوش بے حصول پر نادم
گرد آلود رخ جھکی ہوئی نظریں
پشت پر زندگی کا بوجھ لیے
منتظر اپنے اپنے گاہک کے

فہمیدہ نے اپنی نظموں میں استفہامیہ انداز بیان کے ساتھ ساتھ خطابیہ بیان کو بھی اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں میں اپنے آپ کو خطاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بیانیہ نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ مکالماتی انداز بیان سے بھی اپنی نظموں میں دلکشی اور چاشنی پیدا کی ہے۔ اگر ان کی نظموں کی زبان پر بات کی جائے تو انھوں نے آسان لفظوں کا زیادہ استعمال کیا ہے۔ اور یہی فہمیدہ کی نظموں کی خصوصیت ہے جس نے انھیں اپنے ہم عصر شاعرات میں ممتاز رکھا ہے۔

❑❑❑

محمد فیصل خان
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی
9918998144

کیفیؔ کی شعری کائنات کے تین رنگ

ترقی پسند شاعروں میں کیفیؔ اعظمی ایک محبوب ترین انقلابی شاعر ہیں جو کسی شہرت اور ناموری کے محتاج نہیں۔ ان کی انفرادیت ان کے لہجے کی گرمی اور انقلابانہ رویّے سے پہچانی جاتی ہے۔ انھوں نے نظمیں بھی لکھیں ہیں اور غزلیں بھی، نغمے بھی لکھے ہیں اور مضامین بھی، مکالمے بھی لکھے ہیں اور گیت بھی، کالم بھی لکھے ہیں اور مثنوی بھی۔ ان کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ کہ ان کی شاعری میں ایک ایسے احساسِ فرد کی گونج ہے جو پوری دانائی اور حکمت کو اپنا کر ناامیدی کی تاریکیوں میں بھی زندگی کی آنکھ سے آنکھ ملانے کا حوصلہ اور عزم رکھتا ہے اور اپنی ذات کے ساتھ اپنے شعر وسخن کو بھی انسانیت کی بقا کے لیے قربان کر دیتا ہے، جس کی بنا پر تہذیب وثقافت کی تمام لذتیں اور زبان وادب کی تمام حلاوتیں اسے حاصل ہیں۔ اسی احساسِ فرد کی موجودگی نے کیفیؔ اعظمی کو اپنے دور کے عصری تقاضوں کو سمجھنے اور برتنے میں مدد کی۔ چنانچہ آگے چل کر انھوں نے اپنی شاعری میں ماضی کے رچے ہوئے احساس کو انسانی تجربات سے ملا کر احتجاجی لب ولہجے میں نادر تشبیہات واستعارات سے مزین کر کے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس پر آشوب عہد کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی کا بھرپور عکس سامنے آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری خواص پسند نہ ہو کر عوام پسند رہی ہے۔ کیفیؔ اعظمی اپنے شعری خیالات کی اڑان اور تخیلات کی پرواز کو زمین سے جوڑے رکھتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں 'سجاد ظہیر' لکھتے ہیں کہ :

> ''کیفی کی شاعری قدیم وجدید دونوں قسم کی ادبی غلاظتوں سے پاک ہے۔ اس میں سچی ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کا خیال ونصب العین صاف ومتعین، اس کا طرز بیان سیدھا اور براہِ راست، اس کی تشبیہیں واستعارے نئے اور دلکش ہیں۔ وہ اشتراکیت کا پرجوش حامی ہے۔۔۔ اس کے خیال ومقصد حیات، اس کی زندگی اور عمل میں تضاد نہیں۔''

(''جھنکار'' کیفی اعظمی۔ مشمولہ ''پیش لفظ'' قومی دارالاشاعت، بمبئی ۱۹۴۴ء، ص:۵)

کیفیؔ اعظمی جن کی شہرت ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے غیر معمولی ہے، انھوں نے ابتدا میں عشقیہ رنگ میں رنگی ہوئی نظمیں لکھیں لیکن آگے چل کر قوم پرستی اور آزادیٔ وطن کے لیے نغمے گانے لگے۔ اس کے بعد جب ان کا تعلق اشتراکیت کے علمبرداروں سے ہوا اور انھیں کمیونسٹ اکائی کی رکنیت حاصل ہوگئی تو انھوں نے انقلابانہ نظریے پیش کیے، ساتھ ہی ملک کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور بین الاقوامی واقعات وحادثات کو موضوع بنا کر دلچسپ نظمیں بھی لکھیں۔ کیفیؔ نے عوام کے دکھ درد کو اپنی نظموں میں اس طرح ضم کر دیا ہے کہ موضوع اور فن یک جان نظر آتے ہیں۔ اشتراکی نظریے کے پیشِ نظر کیفیؔ نے سماجی نابرابری اور عوامی استحصال کو اپنی شاعری کے موضوعات میں سب سے اہم مقام عطا کیا ہے اور انقلاب کی آواز بلند کرتے ہوئے ظلم وتشدد سے پاک معاشرے کی تلقین کی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں ادب برائے زندگی کے نام پر مقصدیت، خطیبانہ انداز، آہنگ کی بلندی اور مارکسی پروپیگنڈے کے نقوش ادبی پیرائے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کیفیؔ اعظمی کی نظم 'انتشار' کے یہ اشعار بطور مثال ملاحظہ فرمائیں :

سب اپنے پاؤں پہ رکھ رکھ کے پاؤں چلتے ہیں
خود اپنی دوش پہ ہر آدمی سوار سا ہے

> ''کیفیؔ کے رجائی لب ولہجے کی خود اعتمادی اور یقین نے یہ تو صاف کر دیا تھا کہ وہ خالص اشتراکی نظام کے حامی اور بائیں بازو یعنی کمیونسٹ حکومت کے پرستار ہیں۔ لیکن کیفیؔ نے جلد ہی مزدوروں اور کسانوں کی تحریک میں عملی شرکت کر کے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ کارواں آگے کی کٹھن منزلیں طے کرنے سے قاصر ہے گو کہ اس میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہوں۔ اسی لیے کیفیؔ اپنی شاعری میں اپنے ہم وطنوں کو بھی آزادی کی جدوجہد میں عمل پیہم ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کی نظر اس بات پر ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ ان کی قوم کے افراد بھی آزادی کی جنگ میں حصہ لیں، یہی نہیں کیفیؔ ان تذبذب کا شکار اور فرسودہ خیالات رکھنے والوں سے بھی کوسوں دور ہیں جن کے نظریات اپنی شریک حیات ودیگر خواتین وغیرہ سے متعلق یہ ہیں کہ ''تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی'' حالاں کہ دوسرے ترقی پسندوں نے بھی مرد اور عورت کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرنے کی کوششیں کی تھیں۔''

کیفی اعظمی نے اپنی شاعری کی ابتدا سلطان المدارس میں تعلیم کے دوران روایتی غزل سے کی تھی۔لیکن ایک انجمن کے تحت اپنے کچھ مطالبات منوانے کی غرض سے کیفیؔ اوران کے ساتھیوں نے مل کر مدرسے کے خلاف اسٹرائیک کر دی،اسی دوران کیفیؔ نے غزل گوئی ترک کر کے احتجاجی اور انقلابی نظمیں کہنی شروع کر دیں۔کیفی خود کہتے ہیں کہ گیارہ برس کی عمر میں مَیں نے اپنی پہلی غزل کہی جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں :

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکرِ نشیب و فراز ہے
اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے

کیفی کی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں نیا رنگ و آہنگ اور ایک قسم کی ادبی خوش مذاقی پائی جاتی ہے۔لیکن کیفیؔ کی شاعری پر اکثر و بیشتر ناقدین نے اعتراضات ظاہر کیے ہیں اور اسے وقتی آواز اور جوش وولولوں سے لبریز ہنگامی اور خطیبانہ شاعری قرار دیا ہے۔ان کے شعری سفر کو تین ادوار میں تقسیم کر کے پہلے اور دوسرے دور کو یہ کہتے ہوئے نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیفی اس وقت رومانیت اور تغزل سے آزاد رہ کر عصری مسائل کو سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی اس لیے ان کو ، اس دور کی نظموں کو ،قبولِ عام اس دور میں تو مل گیا مگر بعد میں وہ کیفی کی پہچان نہ بن سکیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ناقدین کی یہ آرا درست ہے؟ کیا یہ ادبی انصاف کے منافی ہے؟ کیا کیفی اعظمی کی شاعری واقعتاً اپنے اندر دیرپا اثرات نہیں رکھتی؟ کیا وقتی شاعری کا Symbol لگا کر کیفیؔ کے سارے کے سارے اثاثے کو ردّی کی ٹوکری میں ڈالا جا سکتا ہے جس نے اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کر دیا؟ کیا ان فن پاروں کی کوئی ادبی حیثیت نہیں؟ اگر ایسا ہے تو اردو ادب کی دنیا میں بہت سے شاعر ایسے مل جائیں گے جن کے یہاں وقتی ضرورت پر اظہار خیال دیکھنے کو ملتا ہے مگر ان کے طرزِ بیان نے انھیں آج بھی زندہ رکھا ہے۔بالکل اسی طرح کیفیؔ اعظمی کے یہاں بھی اسلوب کی دلکشی و رعنائی موجود ہے جس پر ایک عمدہ تخلیقی کارنامے کا انحصار ہوتا ہے۔اس بنا پر ہمیں ان باتوں کی طرف توجہ کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ کیفیؔ کو ان کا وہ حق مل سکے جس کے وہ حق دار تھے۔اس طریقے کے کچھ سوالات معتبر ناقد و محقق پروفیسر شارب ردولوی نے بھی اپنے مضمون 'ترقی پسند شاعروں میں کیفیؔ اعظمی کی انفرادیت' میں اٹھائے ہیں، شاید ان سوالوں کے جوابات اب بھی ناپید ہیں۔

کیفی کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کرنا تو حق بجانب ہے اس سے ان کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کیوں کہ ان کی شاعری کئی مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔کیفیؔ کے پہلے دور کا آغاز تو رومان پرور فضا کی حسین وادیوں میں ہی ہوا جہاں وہ عشقیہ مضامین سے بھرپور اور فطرت کی حسین تصویروں سے سجی ہوئی نظمیں لکھ رہے تھے جس میں غنایت کے علاوہ عاشقانہ لب و لہجہ بھی شامل تھا۔اس دور کی رومانی نظموں میں احتیاط، ملاقات، نصیحت ،آندھی، اندیشے، تبسم، حوصلہ، شام، پشیمانی، تصور، نقش و نگار، مجبوری، سویرے سویرے، دھواں اور برسات کی ایک رات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان میں آج بھی تازگی، رعنائی، دلکشی، نغمگی ،نرمی، جذبے کی سچائی، خواب آفرینی اور تاثر کی وہ فضا موجود ہے جس سے اردو شعر و ادب کی دنیا میں موجود بہترین رومانی اور عشقیہ نظموں کی فہرست میں ان کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر مذکورہ بالا نظموں میں سے صرف دو نظموں کے ایک ایک بند پیش کیے جاتے ہیں :

فلک گا رہا ہے زمیں گا رہی ہے
کلیجے میں ہر لے چھپی جا رہی ہے
مجھے پا کے اس مستِ شب میں اکیلا
یہ رنگیں گھٹا تیر برسا رہی ہے

(برسات کی ایک رات)

کلی کا روپ، پھول کا نکھار لے کے آئی تھی
وہ آج گل خزانۂ بہار لے کے آئی تھی
مری اُجاڑ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
وہ گیسوؤں کا ابر عطر بار لے کے آئی تھی
اداس اداس زیست کو سنا رہی تھی بانسری
گھٹے گھٹے سکوت میں ستار لے کے آئی تھی

(ملاقات)

کیفی کے دورِ اوّل کی شاعری کیف و نشاط سے بھرپور ہے جس کا خمیر ان کی جوانی کے جذبے سے تیار ہوا تھا۔اس کا مشکل پسندی اور ابہام سے کوئی تعلق نہیں، یہاں مرصع کاری کے بجائے سادگی اور صفائی ہے جو دلوں کو چھوتی اور ذہنوں میں ہلچل پیدا کرتی ہے،اس کی سب سے بڑی خوبی تصویریت ہے۔اس میں تمام جذبات و احساسات کا ذکر حسن و جمال سے آراستہ تصویروں کے ذریعے ہوتا ہے جس میں مناظرِ فطرت کو اہمیت حاصل ہے۔اوپر بطور مثال دیئے گئے اشعار میں یہ تمام خوبیاں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی اپنے مضمون 'ترقی پسند شاعروں میں کیفی اعظمی کی انفرادیت' میں رقم طراز ہیں :

"کیفی کی شاعری اردو میں پیکر تراشی کی اعلیٰ مثال ہے۔میں نے کسی جگہ لکھا تھا کہ کیفی کی شاعری میں تصویریں زیادہ ہیں اور الفاظ کم۔اس لیے کہ ان کے بیشتر الفاظ مرقع کی ایک سے زائد تصویریں بتاتے ہیں۔"

(''نیا سفر'' الہ آباد۔مرتبین'' سید عاشور کاظمی، علی احمد فاطمی'' اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲ء ص:۱۰۲)

آگے چل کر جوشؔ، مجازؔ اور علی سردار جعفری جیسے شاعروں کی طرح کیفیؔ بھی رومانی اور عشقیہ لب و لہجے کو چھوڑ کر انقلاب کی طرف مائل ہوئے یہ ان کی شاعری کے دوسرے دور کی ابتدا ہے جو تقریباً ۱۹۴۵ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔اس دور میں کیفیؔ کا سامنا دردناک صورتِ حال سے ہوا جہاں انھیں کرب ، مایوسی، شکست ، ناامیدی، قتل عام اور آپسی رسہ کشی جیسے بے شمار فسادات دیکھنے کو ملے۔ان حالات کا اثر کیفی کی شاعری پر یوں پڑا کہ غم عشق سے نکل کر غم زندگی پر گفتگو کرنے لگے۔لہٰذا اس عہد میں کہی گئی نظموں کے اندر بے باکی بھی تھی اور سچائی بھی، سیاسی و سماجی جبر و تشدد کے خلاف آواز بھی تھی اور نفرت کا جذبہ بھی ،غیر ملکی سامراج کے خلاف غم و غصہ کا اظہار بھی تھا اور مر مٹنے کا حوصلہ بھی۔یعنی کیفیؔ رومانیت سے نکل کر باغی احساس فکر کی شاعری کرنے لگے جو اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات کا باہمی سنگم کہی جا سکتی ہے۔اس میں صرف خیال آرائی یا آرزومندی ہی نہیں بلکہ ان کی انقلابانہ زندگی اور اس میں کی گئی جد و جہد کا عکس بھی موجود

ہے۔ذیل میں موجود آوارہ سجدے کے پیش لفظ سے فیض احمد فیضؔ کا اقتباس دیکھیں اس سے بڑی حد تک مذکورہ بالا خیالات کی تائید ہو جاتی ہے :

''غم جاناں کا ذکر ہو کہ غم دوراں کا ___ بوسۂ لب کی بات ہو کہ بوسۂ زنجیر کی، کیفی بات ہمیشہ کھری کرتے ہیں۔ جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گرد و پیش موجود ہے اس کی بے کم و کاست منظر کشی کیفی کا مسلک شعر ہے۔''

(''آوارہ سجدے'' کیفی اعظمی۔ مشمولہ ''پیش لفظ'' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۷۴ء۔ص:۸)

کیفیؔ کے رجائی لب و لہجے کی خود اعتمادی اور یقین نے یہ تو صاف کر دیا تھا کہ وہ خالص اشتراکی نظام کے حامی اور بائیں بازو یعنی کمیونسٹ حکومت کے پرستار ہیں۔لیکن کیفیؔ نے جلد ہی مزدوروں اور کسانوں کی تحریک میں عملی شرکت کر کے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ کارواں آگے کی کٹھن منزلیں طے کرنے سے قاصر ہے گو کہ اس میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہوں۔اسی لیے کیفیؔ اپنی شاعری میں اپنے ہم وطنوں کو بھی آزادی کی جدوجہد میں عمل پیراں ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ان کی نظر اس بات پر ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ ان کی قوم کے افراد بھی آزادی کی جنگ میں حصہ لیں، یہی نہیں کیفیؔ ان تذبذب کا شکار اور فرسودہ خیالات رکھنے والوں سے بھی کوسوں دور ہیں جن کے نظریات اپنی شریک حیات و دیگر خواتین وغیرہ سے متعلق یہ ہیں کہ ''تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گی'' حالاں کہ دوسرے ترقی پسندوں نے بھی مرد اور عورت کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کرنے کی کوششیں کی تھیں لیکن اس ضمن میں انھوں نے اتنی شدت اختیار نہیں کی۔اب مجازؔ لکھنوی کو ہی لے لیجیے وہ صرف آنچل سے پرچم بنانے کی بات کر کے خاموش ہو جاتے ہیں جب کہ اس کے برعکس کیفیؔ اعظمی کے تفکرات وخیالات اور نظریات کا اندازہ ان کی مشہور زمانہ نظم 'عورت' سے لگایا جا سکتا ہے جہاں عورت کی ذات کو یہ ترغیب دی جا رہی ہے کہ تم بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ چلو۔ یہاں مثال کے طور پر نظم کے دو بند نقل کیے جاتے ہیں :

اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قلبِ ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج
جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

*

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اُڑنے کھلنے میں ہے نکہتِ خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان ! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

کیفیؔ اعظمی کی شاعری میں مارکسی تعلیمات اور اشتراکی نظریات کی گہری چھاپ پائی جاتی ہے،ان کی زیادہ تر نظمیں اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں ان میں کرن، نئے خاکے نئی جنت، تلاش، ہم، آخری مرحلہ، آزادی، یلغار، کب تک، فیصلہ، سرخ جنت، استقلال، سویت یونین اور ہندوستان، فتح برلن، ہم آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں اور تلنگانہ وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو اس وقت کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کو نظر میں رکھ کر تخلیق کی گئی تھیں۔حالاں کہ ان نظموں کی اہمیت اب وہ تو نہیں رہی جو پہلے تھی لیکن اس کے باوجود زندگی کے بہت سے مخصوص حصوں میں یہ آج بھی ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ اردو شاعری میں کیفیؔ اعظمی اکیلے ہی ایسے شاعر ہیں جو ترقی پسند تحریک کے زوال سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔کیفیؔ نے اپنی شاعری اور اسلوب دونوں کو انقلابی اور پابند نظموں کی چاشنی میں مقید کر لیا تھا اسی وجہ سے جب مارکسی تحریک روبہ زوال ہوئی اور تلنگانہ کا انقلاب دم توڑنے لگا اور ہر طرف اشتراکیت کے افتراق سے نئے حالات کا ظہور ہوا تو ایک طویل مدت تک کیفیؔ پر سکوت طاری رہا۔اس بات کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ کیفیؔ کا دوسرا شعری مجموعہ 'آخر شب' ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا اور اس کے بعد تیسرے شعری مجموعے کے لیے جو 'آوارہ سجدے' کے نام سے ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آیا قارئین کو ۲۶ سال کے لمبے وقفے کا انتظار کرنا پڑا۔یہ دور اس وقت کے ان تمام شاعروں پر پڑا جو ترقی پسند ذہنیت کے حامل تھے۔آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ علی سردار جعفری، جاں نثار اخترؔ، اور پرویزؔ شاہدی جیسے شاعروں نے اپنے اسلوب، لب و لہجے اور طرز ادا سے لے کر طرز فکر تک میں جدّت پیدا کی۔اسی طرح کیفیؔ اعظمی نے بھی اپنی شعری زندگی میں ایک نیا باب روشن کیا۔کیفیؔ کے اس دور کا آغاز ۱۹۶۲ء کے آس پاس ہوتا ہے جو ان کے ادبی سفر کا سب سے اہم اور قیمتی سرمایہ ہے جسے ناقدین نے ان کے تیسرے دور سے تعبیر کیا ہے۔یہاں کیفیؔ نے نیا حسن، دعوت اور ایک بوسہ جیسی مایہ ناز نظمیں لکھ کر یہ اعلان نامہ جاری کیا کہ وہ اپنی ذاتی کیفیات کو صرف سخت لہجے اور خطیبانہ انداز کے دم پہ ہی نہیں بلکہ انسان دوستی، ہمدردی اور غمخواری کی روش پر چل کر نرم لہجے میں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ یہاں 'ایک بوسہ' نظم کے کچھ اشعار سے کیفیؔ کے نئے انداز کو سمجھنے میں ضرور مدد ملے گی۔اشعار ملاحظہ فرمائیں :

جب بھی چوم لیتا ہوں ان حسین آنکھوں کو
سو چراغ اندھیرے میں جھلملانے لگتے ہیں
پھول کیا، شگوفے کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سب رقیب قدموں پر سر جھکانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں اُجڑے اُجڑے گلشن میں
پیاسی پیاسی دھرتی پر ابر چھانے لگتے ہیں
لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

اس دور میں کیفیؔ کی شاعری غریبوں، مزدوروں اور بے کسوں سے ہمدردی کا اظہار کرتی ہے، انسان دوستی سے اپنے رشتے کو مزید مضبوط و مستحکم بناتی ہے اور انسانی زندگی کے مسائل پر غور و فکر کر کے ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ انسانی دردمندی کے ساتھ ساتھ کیفیؔ کے یہاں رجائیت اور امید کی کرن بھی پائی جاتی ہے۔سماج میں ہونے والے واقعات جس میں فرقہ واریت کا رنگ ملا ہوا ہو، مذہب کو نشانہ بنا کر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے ہوں، کسی مخصوص طبقے کے ساتھ جانب دارانہ رویہ اختیار کیا گیا ہو،

کسی ملک یا شہر والوں کے ساتھ خون خرابے کا معاملہ درپیش ہو کسی مظلوم کے ساتھ حق تلفی کی گئی ہو یا کسی بھی قسم کا کوئی فساد برپا ہوا ہو تو کیفیؔ کے یہاں افسردگی کا احساس شاید سب سے پہلے دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس ضمن میں ابن مریم، تلنگانہ، بنگلہ دیش، ماسکو، نہرو، تاشقند اور دھماکہ جیسی نظمیں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔ 'ابن مریم' نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں جس میں بے یارومددگار اور آوارہ پھر رہے ایک بے آسرا شخص نے حضرت عیسیٰ کے مجسمے پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا جو انسانوں کے مسیحا اور ان کے دکھوں کی دوا سمجھے جاتے ہیں کہ اگر یہ مجسمہ ہٹ جائے تو میں یہاں آرام کرلوں :

مجھ کو دیکھو کہ میں تھکا ہارا
پھر رہا ہوں یگوں سے آوارا
تم یہاں سے ہٹو تو آج کی رات
سو رہوں میں اسی چبوترے پر
تم یہاں سے ہٹو خدا کے لیے

کیفیؔ اعظمی کی اس نظم سے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں جس میں ویت نام کی جنگ کا منظر نامہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مظالم اور استحصال کا شکار ہو رہی انسانیت کا خوف زدہ شخص مجسمے کے سامنے فریادی بن کر کھڑا مدد کی بھیک مانگ نے پر مجبور نظر آرہا ہے :

جاؤ ، وہ ویت نام کے جنگل
اس کے مصلوب شہر ، زخمی گاؤں
جن کو انجیل پڑھنے والوں نے
روند ڈالا ہے پھونک ڈالا ہے
جانے کب سے پکارتے ہیں تمھیں
جاؤ ، اک بار پھر ہمارے لیے
تم کو چڑھنا پڑے گا سولی پر

حالات کیسے بھی ہوں، ظلم کی آندھی کتنی ہی سخت ہو جائے اور اندھیرے کا تسلط کتنا ہی مضبوط و مستحکم کیوں نہ ہو کیفیؔ امید کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتے اور پورے بھروسے کے ساتھ حالات کے بدلنے کی بات کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کیفیؔ کی امید کا دیا ہمہ وقت روشن نظر آتا ہے۔ اس پس منظر میں لکھی ایک نظم 'چراغاں' کے چند مصرعے پیش خدمت ہیں :

ایک دو بھی نہیں چھبیس دیئے
ایک اک کر کے جلائے میں نے
اک دیا نام کا آزادی کے
اک دیا نام کا خوشحالی کے
اک دیا نام کا یکجہتی کے
بجھ گئے سارے دیئے
ہاں مگر ایک دیا نام ہے جس کا امید
جھلملاتا ہی چلا جاتا ہے

جب کہ آگے چل کر جیسے جیسے کیفیؔ کا فن پختگی اختیار کرتا گیا انھوں نے اپنی غزلوں میں علامتی انداز تخاطب کو جگہ دینی شروع کی جو سماجی وابستگی کی بنیاد پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور کیفیؔ کی شاعری میں اس کے گہرے نقوش سے جن حضرات کو واقفیت ہے وہ یہ ضرور محسوس کریں گے کہ ان کی غزلیں بھی اپنے اندر عصری تقاضوں کی گہری چھاپ رکھتی ہیں جس میں نئے معنیاتی نظام کی گونج اور نئے شعری لہجے کی دھمک پائی جاتی ہے۔ یہاں ایک ہی سے غزل کے چند اشعار بطور استدلال کے پیش کیے جاتے ہیں :

خار و خس تو اٹھیں راستہ تو چلے
میں اگر تھک گیا قافلہ تو چلے
چاند سورج بزرگوں کے نقش قدم
خیر بجھنے دو ان کو ہوا تو چلے
بیلچے لاؤ کھولو زمیں کی تہیں
میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

کیفیؔ اعظمی کو ان کے فن اور افکار و نظریات کے آئینے میں جانچ نے کے بعد یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ ان کی شاعری رومان پرور فضا سے نکل کر انقلاب اور انقلاب سے نکل کر عالمی پیمانے پر انسانوں کی دردمندانہ زندگی پر مرہم رکھنے کی کوشش تک پھیلی ہوئی ہے، جو ایک وسیع و عریض پس منظر میں مختلف النوع جہات کا احاطہ کرتی ہے۔ کیفیؔ کے یہاں ایک طرف رومانیت ہے تو دوسری طرف خطیبانہ لب و لہجے میں گھن گرج الفاظ کا جامہ پہنے ظلم و استبداد کے خلاف مزاحمت بھی ہے اور معراج فن پر آتے ہی انسان دوستی، سوز و گداز، مظلوموں سے ہمدردانہ تعلق اور انفرادی کرب کی گونج نرم و نازک انداز میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یعنی کیفی کی شعری کائنات بوسۂ لب اور بوسۂ زنجیر کی حسین کیفیتوں سے گزر کر انسانیت کی بقا کا علم بلند کرتی ہے۔ یہ ایک ایسے فن کی مثال ہے جو کیفیؔ کے زمانے میں مسلسل ارتقا کی طرف گامزن رہا، ٹھہراؤ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں اور اگر کہیں ٹھہراؤ نظر بھی آتا ہے تو فن میں نکھار اور نیا پن لانے کی غرض سے نہ کہ تھک کر بیٹھ جانے کی وجہ سے۔ تاہم کیفیؔ اعظمی کا سرمایہ اردو شاعری کے باب میں ایک اہم جز کی حیثیت رکھتا ہے جس کو مزاحمتی ادب کہہ کر اور نعرے بازی کا لیبل لگا کر ہرگز ٹالا نہیں جاسکتا اس لیے کہ یہ سراسر ادبی بددیانتی ہوگی۔ اگر غور کیا جائے تو آج بھی اس مزاحمت کی مزید ضرورت محسوس کی جارہی ہے کیوں کہ آج کے مسائل پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہیں، آج لوگوں پر مظالم کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے جارہے ہیں، ایسے تو سامراجیت (Imperialism) کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن اب ایک نئی طرح کی سامراجیت آگئی ہے جس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے۔

نواستعماریت، نو سامراجیت اور جمہوریت میں ایک نئے طرح کی آمریت نے لوگوں کے دلوں سے خلوص اور محبت کو ختم کر دیا ہے۔ اسی لیے اس عہد میں ترقی پسندانہ رجحان یا ادب کی اہمیت اور معنویت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے کیوں کہ ترقی پسند ادب ہی ایک ایسا ادب ہے جو ظلم و زیادتی اور آمریت کے خلاف احتجاج بلند کرتا ہے۔ شاعری اور فکشن کے ذریعے ہر اس عمل کی مخالفت اور مزاحمت ادبی پیرائے میں بیان کرتا ہے جس سے ایک فرسودہ سماج کی تشکیل ہوتی ہے اور کیفیؔ اعظمی کا تخلیق کردہ شعری سرمایہ ان اصولوں پر کھرا اترتا ہے جس میں ایک نئے اور خوبصورت سماج کے عناصر جا بجا جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

❑❑❑

غزل

موت منظور ہے نہ مات ہمیں
چاہئے پھر بھی کائنات ہمیں

ایک ہی صف کے ہم نمازی ہیں
بانٹتی کیوں ہے ذات ، پات ہمیں

کیا تسلسل کے ساتھ ماضی کے
یاد آتے ہیں واقعات ہمیں

لگ رہی ہے تری زبانی کیوں
بات امن و اماں کی گھات ہمیں

بادشاہت نصیب کرتی ہے
آپ کی چشم التفات ہمیں

دن کے دامن میں منہ چھپائے ہوئے
گنگناتی ہے کالی رات ہمیں

جب تھے ہم شہسوارِ حق مصداقؔ
راہ دیتی رہی فرات ہمیں

مصداق اعظمی
مجواں، پھول پور، اعظم گڑھ
9451431700

غزل

باعث مرگ مرض کو ہی کہا جاتا ہے
موت کے سر کوئی الزام کہاں آتا ہے

بھیجتا ہے وہ برہنہ ہمیں اس دنیا میں
محفل دہر میں کپڑے وہی پہناتا ہے

جس کی حق گوئی کی کھاتا تھا زمانہ قسمیں
جھوٹ کی پیروی کرتے نہیں شرماتا ہے

تو جو آجائے تو ممکن ہے قرار آجائے
آج اے دوست بہت دل مرا گھبراتا ہے

دشمن جاں! تو ابھی جیت کی خوشیاں نہ منا
قصر دل پر مرے پرچم ابھی لہراتا ہے

جس کے الفاظ صداقت کے امیں ہوتے ہیں
ایسا ہر نغمہ مرے دل کو بہت بھاتا ہے

میری تنقید کا محور ہے کوئی اور شفیع
رنگ کیوں آپ کے چہرے کا اڑا جاتا ہے

ڈاکٹر محمد شفیع سیتاپوری
محلہ ہدایت نگر، لکھیم پور، کھیری یوپی
9453617899

غزل

سارے کنبے کو کھلانے کے لیے کافی ہے
باپ اکیلا ہی کمانے کے لیے کافی ہے

مجھ گنہگار پہ اِک چشمِ کرم اے مولا
پھوٹی تقدیر بنانے کے لیے کافی ہے

ہوش محفل کے اڑانے کو ہمارا اپنا
ایک ہی شعر سنانے کے لیے کافی ہے

یہ تیرے عیب، ریا کاری، اناؤں کا بھرم
تجھکو نظروں سے گرانے کے لیے کافی ہے

ایک بیٹا ہی سہی میرے بڑھاپے کے لیے
آخرت میری بنانے کے لیے کافی ہے

تم کو معلوم ہے ماچس کی یہ ننھی تیلی
ساری بستی کو جلانے کے لئے کافی ہے

پیار کے گیت محبت بھری غزلیں رہبرؔ
روٹھے دلبر کو منانے کے لیے کافی ہے

کلیم رہبر

امڈاپور۔ضلع بلڈانہ۔مہاراشٹر

9767125832

غزل

رشک آتا ہے اس زمانے پر
لوگ روتے تھے دکھ سنانے پر

کوئی پوچھے تو! دل دکھانے پر
کیا گزرتی ہے اک دِوانے پر

اس کے در پر ہی میرے جیسوں کی
سربلندی ہے سر جھکانے پر

میری ہستی بھی اک گھروندہ ہے
ٹوٹ جائے گی پھر بنانے پر

روٹھتے ہیں وہ بے سبب لیکن
مان جاتے ہیں پھر منانے پر

میکدے میں چراغ روشن ہے
تیرگی ہے کتاب خانے پر

کیا سبب ہے؟ کہ سر مرا مجھکو
بوجھ لگتا ہے میرے شانے پر

شعیب اختر

رحمت نگر، ڈانگر ڈیہہ، مانگو، جمشید پور

6201340056

پروفیسر اسلم جمشید پوری
سی ۔ ۵ سی سی ایس یونیورسٹی کیمپس، میرٹھ
8279907070

افسانہ

بارش اور پیاس

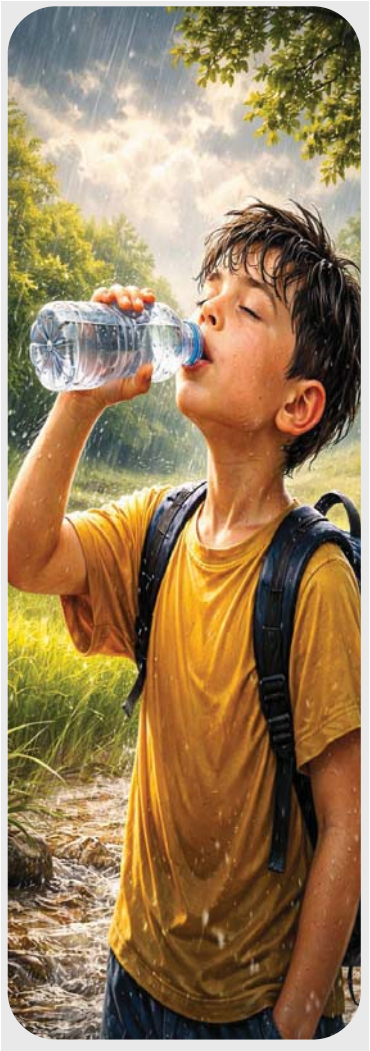

اس کے گھر میں کئی دن سے فاقے تھے۔ایسے میں رمضان کا مہینہ آگیا۔میاں بیوی اور دو بچے۔بس یہی اس کا خاندان تھا۔ اس کی بیوی عائشہ بہت صبر دار تھی۔وہ اللہ کی رضا میں راضی تھی۔وہ کسی طرح بچوں کا پیٹ بھر رہی تھی اور دونوں میاں بیوی کبھی باسی روٹی، کبھی بچوں سے بچی کھچی بانٹ کر کھالیتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔

بات یہ نہیں تھی کہ وہ ناکارہ تھا۔وہ ایک رئیس کا ڈرایور تھا۔وہ روزانہ اپنے کام پر وقت سے جاتا، دن بھر رئیس کے ساتھ رہتا۔وہ جہاں کہتا، وہ کار سے اسے لے جاتا۔اس کی شہر میں چار فیکٹریاں تھیں شہر کے پاش علاقے میں اس کا شاندار آفس اور گھر تھا۔نوشاد روز پابندی سے اپنے کام پر جاتا۔بڑی مشکل سے اس کی گذر بسر ہو رہی تھی۔اسے کل پندرہ ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے۔بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے۔تنخواہ کے پیسے کھانا، کپڑا اور مکان کے کرائے میں خرچ ہو جاتے۔کسی ماہ اگر کوئی بیمار پڑ جاتا تو ادھار کی نوبت آجاتی۔ابھی پچھلے ماہ ہی اس نے اپنے مالک سے پانچ ہزار روپے ادھار لئے تھے۔اس کی بیٹی کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔اس نے کئی بار کوئی اور کام کرنا چاہا لیکن وہ ناکام رہا۔اس کی اس حالت سے اس کا مالک واقف نہیں تھا۔حشمت علی شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔اس کی کئی فیکٹریاں تھیں۔اس کے پاس بے شمار دولت تھی۔وہ بہت نیک دل اور خدا ترس بھی تھا۔ہر ماہ ہزاروں اور لاکھوں روپے وہ غریبوں اور معذوروں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔وہ پابندی سے زکوٰۃ اور صدقات دیتا تھا۔رمضان کا مہینہ آیا تو اس نے غریبوں میں مہینے بھر کا راشن بانٹنے کا منصوبہ بنایا۔وہ ہر روز اپنی بڑی سی کار میں راشن لوڈ کرواتا اور نوشاد کے ساتھ جا کر غریب بستیوں اور فٹ پاتھ والوں میں بانٹ آتا۔ابھی رمضان کے دو تین روزے ہی گذرے تھے۔حشمت علی عید گاہ کے بڑے شیڈ میں روزانہ غریبوں کے افطار کا بھی انتظام کرتا۔وہ وہاں مردوں اور عوتوں کا الگ الگ انتظام کرتا۔افطار میں مختلف طرح کے پھل، کھجور، مسالے دار چنے، پکوڑیاں اور شربت کا اہتمام ہوتا۔انتظام میں اس کے نوکر چاکر اور عید گاہ کمیٹی کے لوگ مستعدی سے لگے رہتے۔کبھی کبھار وہ بھی عید گاہ میں افطار کرتا کہ پتہ لگائے انتظام ٹھیک ہوتا ہے کہ نہیں۔

نوشاد، حشمت علی کے ساتھ ہمیشہ ہوتا۔کپڑے تقسیم کرنے ہوں، راشن بانٹنا ہو، اسپتال میں پھل تقسیم کرنا ہو یا کسی غریب کو پیسوں سے مدد کرنی ہو۔نوشاد ہمیشہ حشمت علی کے ساتھ ہر تقسیم کے وقت ہوتا، اس کی وجہ حشمت کا نوشاد پر بے انتہا اعتماد تھا۔نوشاد کے گھریلو حالات سے حشمت واقف نہیں تھا۔نوشاد کبھی چار بجے تو کبھی پانچ بجے حشمت کو گھر پہنچا کر فارغ ہو جاتا۔حشمت کو اگر کسی ایمرجینسی میں کہیں جانا ہوتا تو اس کا بیٹا کار چلاتا یا وہ خود کار چلا لیتا۔نوشاد کی گھریلو حالت ٹھیک نہیں تھی۔اس کی بیوی عائشہ کسی طرح گھر کا خرچ چلا رہی تھی۔وہ بازار سے سڑے گلے پھل بہت کم قیمت پر لے آتی۔پھل کے خراب حصے کاٹ کر الگ کرتی اور اپنے بچوں کو کھلاتی۔ایک دن عائشہ نے اس سے اپنے مالک سے ایڈوانس میں کچھ پیسے مانگنے کو کہا۔

''دیکھو جی ۔۔۔ایک بات کہوں؟'' ''جی ۔۔بولو نا۔'' وہ جانتا تھا کہ وہ کیا بولے گی۔'' اپنے مالک سے کچھ پیسے ادھار لے لو۔گھر میں آٹا بالکل ختم ہو رہا ہے۔دال چاول بالکل ختم ہو گئے ہیں۔۔مہینہ پورا ہونے میں ابھی دس دن باقی ہیں۔۔'' ''میں کوشش کروں گا۔۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔وہ جلد ہی وہاں سے چلا آیا۔

آج حشمت علی نے بڑی گاڑی نکالنے کو کہا تھا۔بہت سارا راشن غریبوں کو تقسیم کرنا تھا۔ایک غریب بستی میں جب گاڑی داخل ہوئی تو کالی پیلی شکلوں والی عورتیں،کمزور ولاغر بوڑھے،کسی کا ایک ہاتھ کٹا ہوا،کسی کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ،مردوں نے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔نوشاد نے گاڑی روکی۔نیچے اتر کر سب کو قطار لگانے کو کہا۔طاقتور آگے آگئے۔اس نے پیکٹ بانٹنے شروع کئے۔ہر ایک پیکٹ میں دس کلو آٹا،پانچ کلو چاول،دو کلو چینی،دو لیٹر تیل،کھجور کا ایک پیکٹ،دو کلو بیسن اور کچھ مصالحے تھے۔نوشاد نے ایک ایک پیکٹ قطار والوں کو دینا شروع کیا۔پیکٹ بانٹتے بانٹتے اسے اپنے گھر کی یاد آگئی۔عائشہ نے آج مالک سے ادھار لانے کو کہا تھا تاکہ راشن آسکے۔آٹا،چاول،چینی ،تیل،پھل،دالیں،مصالحے وغیرہ۔اس نے ایک بار کو سوچا بھی کہ کسی طرح حشمت علی کے پیکٹوں میں سے ایک پیکٹ بچا لے۔حشمت علی پوچھے تو کہہ دے مجھے بھی پیکٹ کی ضرورت ہے۔گھر کا تمام راشن اس پیکٹ میں بند تھا۔مانو اس کی قسمت اور خودداری اس پیکٹ میں بند ہو۔بیوی بھی خوش ہو جائے گی اور بچوں کا دل بھی بہل جائے گا۔ان کے دوستوں کے گھر اچھی اچھی افطاری بنتی ہے۔ایک بار معصوم بیٹے نے اس سے کہا تھا،جو ابھی پانچ سال کا ہی تھا۔

"پاپا پا۔۔میرے کئی دوستوں کے یہاں فروٹ چاٹ کئی طرح کی پکوڑیاں،مٹھائیاں،مرغے کی پکوڑیاں،طرح طرح کے شربت روز بنتے ہیں۔پاپا یہ مرغے کی پکوڑیاں کیسی ہوتی ہیں؟""اچھا بیٹا۔اللہ سے دعا کریں۔وہ ہمیں بھی اچھا اچھا افطار کرائے گا"اس کا اپنے بیٹے سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔بعد میں وہ اور عائشہ بہت روئے۔ایک پیکٹ نیچے گر پڑا تھا،وہ بھی ماضی سے گرتا پڑتا حال میں آگیا۔گاڑی میں اب صرف تین پیکٹ باقی تھے۔جبکہ لینے والے چار تھے۔اس نے رعب گانٹھتے ہوئے دو پیکٹ بانٹے اور ایک بچا لیا۔اور گاڑی کی ڈگی بند کر دی"چلو،چلو۔۔اب کل آنا۔۔"

اس نے لوگوں کو تیز آواز میں کہا اور اسٹیرنگ سیٹ پر آگیا۔پیکٹ تقسیم کرنے میں اسے آدھا گھنٹہ لگ گیا ہوگا۔حشمت علی اگلی سیٹ پر بیٹھا بیٹھا ہی سو گیا تھا۔گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز پر اس کی آنکھ کھل گئی۔نوشاد نے گاڑی آگے بڑھانے کو گیئر ڈالا ہی تھا کہ حشمت علی کی آواز بلند ہوئی"نوشاد۔۔گاڑی روکو۔۔" نوشاد نے مالک کا حکم بجاتے ہوئے گاڑی روک دی۔حشمت گاڑی سے اترا۔غریبوں نے اسے گھیر لیا تھا۔وہ راشن مانگ رہے تھے۔نوشاد بولا"سر میں نے ان سے کل کے لئے کہہ دیا ہے۔۔ہم کل پھر ادھر آئیں گے"

"نہیں نوشاد جو بچ گئے ہیں،انہیں پیسے دے دو۔۔ہم کل دوسری طرف جائیں گے ۔۔اور ہاں ذرا ڈگی کھولو۔۔"مرتا کیا نہ کرتا۔اس کی حالت بینک کے اس کیشئر کلرک کے مصداق تھی،جو اپنے ہاتھوں لاکھوں روپے بانٹتا ہے،مگر اپنی انتہائی ضرورت کے لئے بھی،ایک روپیہ تک نہیں لے سکتا۔اس کے گھر کی حالت غیر تھی۔مگر اس کے اندر خودداری تھی۔وہ اپنے مالک سے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔حشمت علی نے کونے میں پڑے آخری پیکٹ کو نکالا۔

"ارے نوشاد۔۔اس میں تو ایک پیکٹ پڑا ہے۔۔"

اس نے وہ پیکٹ ایک غریب عورت کو دے دیا،باقی لوگوں کو اس نے ہزار ہزار روپے دئے۔سب کو رخصت کر کے وہ گاڑی پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"نوشاد اب چلو۔۔گھر کی طرف لے لو۔۔"نوشاد کے ارمانوں کی دنیا پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔وہ خاموش گاڑی چلاتا رہا۔کچھ دیر بعد وہ ڈرتے ڈرتے مالک سے بولا"مالک۔۔۔مجھے اس ماہ کی تنخواہ سے دو ہزار روپے ایڈوانس دے دو"۔

"نوشاد ابھی بیس دن پہلے تو تمہیں پانچ ہزار روپے دئے تھے۔تنخواہ پر لینا۔۔بار بار مجھے تنگ نہ کرو"نوشاد خاموش ہو گیا۔اسے بہت امید تھی کہ حشمت علی اسے ضرور پیسے دے دے گا۔مگر اس کا جواب سن کر وہ بت بن گیا تھا۔ایسا بت جو بے لباس ہوتا ہے۔جو بے احساس ہوتا ہے۔اسے گرمی سردی،بے عزتی،بے شرمی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔جس کے درد کے نہ خوشی کے آنسو نکلتے ہیں۔وہ بار بار درخواست کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ایسا نہیں تھا کہ حشمت علی برا انسان تھا بلکہ وہ جانتا تھا کہ نوشاد کی حالت ٹھیک ٹھاک ہے۔نوشاد نے کبھی رو،گا کر خود کی حالت نہیں بتائی تھی۔اسے لگتا تھا کہ اس کی بھی کچھ عزت ہے،وقار ہے۔

حشمت علی کا جواب سن کر اس کے چہرے پر مایوسی اور ناامیدی کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔اسے اپنی بیوی اور بچے یاد آرہے تھے۔ان کی خواہشیں اور تمنائیں دم توڑتی نظر آرہی تھیں۔گھر پہنچ کر اس نے گاڑی پارک کی اور مالک کو سلام کر کے رخصت ہو لیا۔ابھی افطار کا وقت ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔اسے اپنے گھر پہنچنے میں آدھا پون گھنٹہ لگتا تھا۔گھر پہنچا تو بیوی کے سوالات نے اسے ایسے گھیر لیا جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے میں جمع ہوتی ہیں۔"کیا ہوا پیسے ملے؟""افطار کا سامان لائے؟""راشن پورا لے آئے نا"وہ سوالات کے حملے سے گھبرا گیا۔اس نے جواب کی جگہ جگہ سے پھٹی چادر اوڑھ لی،اس کے منہ سے نکلا"نہیں۔۔کچھ بھی نہیں۔۔"اس کے جواب نے عائشہ کے جوش اور امیدوں پر پانی پھیر دیا۔وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

نوشاد کے چہرے کی مایوسی کا رنگ،اس کی بیوی کی چہرے پہ بھی چڑھ چکا تھا۔وہ اپنے شوہر سے مری ہوئی آواز میں بولی۔

"مجھے آج بہت امید تھی۔تمہارا مالک ضرور تمہیں پیسے دے دے گا،تم آج راشن اور افطاری کا کچھ سامان لاؤ گے۔بچوں کو بھی آج بہت انتظار تھا کہ ان کے پاپا آج طرح طرح کی افطاری لائیں گے۔"

"میں نے ایک پیکٹ اپنے لئے رکھا تھا مگر جب مالک اسے بھی ایک غریب کو دینے لگے تو میں کچھ نہیں بول پایا۔میری ضرورتیں اور فاقے لب نہیں کھول پائے۔راستے میں،میں نے ایڈوانس پیسوں کے لئے بھی کہا۔مگر ان کے جواب نے مجھے پتھر کا ایک بت بنا دیا،میری خودداری،میری بچی کھچی انا،نے میرے لبوں پر پہرا لگا دیا تھا۔۔میں کیا کرتا؟کیا میں ان کے آگے گڑگڑاتا،ہاتھ جوڑتا،نہیں۔۔"نوشاد روہانسا ہو گیا تھا"کوئی بات نہیں۔۔جیسی اللہ کی مرضی۔۔ایسا کرتے ہیں آج افطار کے لئے عیدگاہ چلتے ہیں۔بچے بھی ٹھیک سے افطار کر لیں گے اور ہم بھی کئی دن بعد پیٹ بھر لیں گے۔"

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔ یہ نہیں ہوگا۔کہیں کسی نے دیکھ لیا تو۔۔خاص کر حشمت صاحب نے۔۔''''وہ کوئی روز تھوڑے ہی آتے ہیں۔۔پھر بچے بھی تو ضد کر رہے ہیں۔ان کی خاطر مان جاؤ۔۔''''نہیں۔۔مجھ سے نہیں ہوگا۔تم جاؤ اور بچوں کو بھی لے جاؤ۔۔''''میری خاطر۔۔بچوں کی خاطر۔۔اور شائد اللہ کی بھی یہی مرضی ہے۔۔''دونوں کے آنسو روکے سے نہیں رک رہے تھے۔نوشاد وہاں سے دور چلا گیا اور جی بھر کر رویا۔بادل ناخواستہ وہ بیوی بچوں کی خاطر افطار کے لئے عیدگاہ چلنے کو تیار ہوگیا۔گھر کی مفلوک الحالی،بچوں کے چہرے پر امیدوں کے رنگ اور بیوی کی ترکیب کے آگے اس نے اپنی ضد کو قدموں تلے روندتے ہوئے بیوی کے قدموں سے قدم ملا دیے تھے۔

عیدگاہ میں وہ خود کو چھپائے چھپائے پھر رہا تھا۔اس نے بچے عائشہ کے ہمراہ کر دیئے تھے اور وہ لوگ زنانے کیمپ میں چلے گئے تھے۔نوشاد نے خود کو بھیڑ میں چھپا رکھا تھا۔وہاں اس کے شناسا لوگ نہیں تھے۔اور اکا دکا تھے بھی تو وہ خود کو چھپائے ہوئے تھے۔افطار کا وقت قریب آگیا۔صفیں لگ گئیں۔

سب کو بٹھایا جانے لگا۔قہراً جبراً وہ بھی ایک صف میں سما گیا۔دور سے دیکھنے پر وہ نظر نہیں آرہا تھا۔افطار ہونے میں تین چار منٹ بچے تھے۔اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔اسے خوف تھا کہ کہیں اس کا مالک نہ آجائے۔سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔حشمت اسے پہچان لے گا۔مگر اسے لگا کہ آج حشمت علی نہیں آیا ہے۔اسے افطار میں رکھی انواع واقسام کی چیزیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔کھجور،شربت،پکوڑیاں،چنے،وہ ان سب سے بے خبر الگ ہی ادھیڑ بن میں غرق تھا۔کہیں آج دیکھ لیا گیا تو پھر کیا ہوگا۔۔؟ مالک کی نظر میں اس کی کیا عزت رہے گی؟ مالک کو سب پتہ چل جائے گا۔کیا ہوا پتہ چل جائیگا تو؟ اچھا ہے۔۔آج اس کے سامنے راز کھل جائے۔اسے احساس تو ہو کہ چگر اغ تلے اندھیرا ہے اور وہ پورے شہر کی تاریکی مٹانے چلا ہے۔کیا اسے نظر نہیں آتا؟ کیا میں نے اس سے ایڈوانس نہیں مانگے تھے؟ اور کیا میں روتا گڑگڑاتا؟ بار بار اس کے ہاتھ جوڑتا؟ میں نے تو اپنے لئے ایک پیکٹ بچا بھی لیا تھا۔پر اس نے کیا کیا؟ اس نے کسی اور کو دے دیا۔مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ یہ پیکٹ کیوں بچایا ہے؟ اس وقت تو نیک نامی کا بھوت سوار تھا۔میرے پژمردہ چہرے اور حالت غیر کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ابھی وہ خیالوں میں مگن ہی تھا کہ اس کی سماعت سے اس کا ہی نام ٹکرایا۔

''نوشاد۔۔نوشاد۔۔''حشمت علی حیرانی سے آوازیں لگا رہے تھے۔

''تم یہاں کیسے؟ ادھر آؤ۔۔''

نوشاد پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔وہ ہلکی ہلکی ٹھنڈ میں بھی پسینے میں تر ہوگیا۔وہ بے لباس ہوگیا تھا۔سارے لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔اس کی بے بسی اور چہرے کی ہوائیوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔

سورج دن بھر کا بھوکا پیاسا مغرب کی گود میں ڈوبنے لگا۔افطار کا سائرن زور سے بجنے لگا اور نظروں نے دیکھا ایک سایہ صفوں کو چیرتا ہوا بھاگ رہا تھا۔کچھ ہی دیر میں وہ اندھیرے کا حصہ بن گیا تھا۔

❑❑❑

غزل

میں آیا ہوں نہیں لایا گیا ہوں
ہوا کے رخ پہ جلوایا گیا ہوں

مجھے معلوم ہے میرا نہیں ہے
میں جس بستی میں بسوایا گیا ہوں

اندھیرے ہی مقدر میں لکھے تھے
مگر سورج سے ٹکرایا گیا ہوں

مجھے منزل کی اب حاجت نہیں ہے
سفر میں اتنا ٹھہرایا گیا ہوں

نہ رستہ ہے ، نہ منزل کا پتا ہے
فضا میں جیسے لٹکایا گیا ہوں

خودی کی جستجو میں تھک گیا دل
میں خود سے بھی تو الجھایا گیا ہوں

بشر کی شکل دے کر اس زمیں پر
ستارہ ہوں کہ بکھرایا گیا ہوں

خدا جانے مری مٹی کہاں تھی
میں کس مٹی سے بنوایا گیا ہوں

سید نازش احمد اُفق اعظمی
علی اپارٹمنٹ،زہرا کالونی،ٹھاکر گنج،لکھنؤ
9305365035

اشتیاق سعید

میرا پیراڈائز، گیتا نگر، فیز۔II بالاجی چوک، میرا روڈ، تھانے

9930211461

افسانہ

چھلانگ

دھاراوی کی جھگّی جھوپڑ پٹّی سے باندرہ بل روڈ کے عالیشان فلیٹ تک اچانک بھیّا نے کیسے چھلانگ لگالی؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گونجنے لگا تھا۔ پھر رہ رہ کہ یہ خیال بھی گزرتا کہ کہیں اُنکے ہاتھ الہٰ دین کا چراغ تو نہیں لگ گیا جسے ذرا گھسا اور ایک لمبا تڑنگا جن حاضر ۔۔۔

''ہاہاہا۔۔کیا حکم ہے میرے آقا ؟''۔

''ہماری اس جھگّی جھونپڑی کو جہاں کے ہر کونے کھدرے سے بساندھ اور سڑاندھ کے بھبکے اُٹھتے رہتے ہیں ایک عالیشان محل میں تبدیل کر کے عطرِ فلیل سے معطر کردو ۔''

''غلام حکم کی نافرمانی پر نادم ہے میرے آقا!''۔

''کیوں ؟۔۔کیا قباحت ہے؟''۔

''گستاخی معاف اے میرے آقا محلوں کا دور بادشاہوں، راجے رجواڑوں کے ساتھ ہی فنا ہوچُکا ''۔

''اس سے کیا غرض؟''۔

''غرض ہے میرے آقا۔ چونکہ نوع اِنسان کی کثیر آبادی نے روئے زمین کو تنگ سے تنگ تر کر دیا ہے۔ زمینوں کی قیمتیں آسمان چھونے لگی ہیں۔ غالباً اسی سبب فی زمانہ کثیر منزلہ فلک بوس عمارتوں کا دور دورہ ہے اور ایسی عمارتوں کی تعمیر ہم جن و ملائک کے اختیار میں نہیں''۔

''آخر کیوں؟ تم تو انسانوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہو، تم جو چاہو آن کی آن میں کر گزرنے کی استطاعت رکھتے ہو''۔

''رکھتا تھا میرے آقا، لیکن جسمانی طاقت سے کہیں زیادہ ذہنی قوت کارگر ہوتی ہے۔ آج ذہن انسانی نے ترقّی و کامرانی کے وہ وہ جوہر دکھلائے ہیں کہ ہم جنوں کا وجود بے معنیٰ معلوم ہونے لگا ہے''۔

''یہ کیا بکواس لے بیٹھے؟''

''بکواس نہیں حقیقت ہے میرے آقا، سٹیلائٹ اور انٹرنیٹ کی ایجاد نے دُنیا کو گلوبل گاؤں میں تبدیل کر رکھ دیا ہے۔ اب انسان مہینوں کا کام منٹوں میں انجام دینے لگا ہے''۔

''یعنی کے اب تم منٹوں کا کام مہینوں میں انجام دینا چاہتے ہو؟''۔

''وقت کا تعین تو کام کی نوعیّت پر منحصر ہے میرے آقا!''۔

''میرے اس کام کے لیے تمھیں کس قدر وقت درکار ہے؟''۔

''گستاخی معاف میرے آقا، غلام پہلے ہی عرض کر چُکا ہے کہ محلوں کا دور لد چُکا ۔۔محلوں کی دوسری شکل بنگلوں کی تھی سو وہ بھی خال خال ہی دکھلائی پڑتے ہیں''۔''سمجھ گیا!۔۔۔اچھّی طرح سمجھ گیا کہ اب تم مجھے اس جھگّی جھونپڑی کی غلاظت سے نکالنے کے اہل نہیں رہے''۔ ''ایسا نہیں ہے میرے آقا، بجائے محلوں کے آپ کو کسی خوبصورت فلیٹ میں منتقل کرنے کی استطاعت اب بھی مجھ ناتواں میں ہے۔ بشرطیکہ آپ حکم صادر فرمائیں''۔

اسی طرح کے خیال ذہن سے اُلجھے ہوئے تھے اور تصور میں آنکھیں جانے کیا کیا دیکھنے لگی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں، بھیا کا اس طرح ایک ہی جست میں دھاراوی کی سلم (slum) سے باندرہ کے ہائی فائی سوسائیٹی میں رسائی مجھے کھلنے لگی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے بس یہی سوال ذہن میں بازگشت کرتا کہ بھیا وہ جادوئی چراغ کیونکر حاصل کر سکے تھے؟ حالانکہ میں بھیا کے سال بھر بعد ہی اس مہانگری کی مایا جال میں آن پھنسا تھا۔

بھیا کامرس سے گریجویٹ تھے۔ قد کاٹھی اچھی تھی، کھلتا ہوا رنگ، چہرے کے نقوش اپنی عمدگی کا دعویٰ کرتے تھے۔ بول چال کا بھی اُن کا اپنا ایک انداز تھا۔ انگریزی زبان بولتے تو انگریز ہی معلوم ہوتے۔ غالباً اسی سبب اُنھیں ایک کینٹین کنٹراکٹر جس کی لگ بھگ تیس کمپنیوں میں کینٹین کے ٹھیکے تھے، ایک برٹش کمپنی کی کینٹین میں بحیثیت مینیجر رکھ لیا۔ کنٹراکٹر میر چندانی سندھی تھا۔ درمیانہ قد، فربہ اندام، توندیل، چندیا سے ایک چوتھائی بال غائب تھے، مجرّد زندگی گزار رہا تھا، اُس پر جو رو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا والی مثال صادق آتی تھی۔ ایسا بھی نہ تھا کہ اس کی کنڈلی سے جورُو کا سنجوگ عنقا تھا۔ اُسکے عزیز دار بتاتے تھے کہ اُس کا لگن ہوا تھا، لیکن! دُلہن کا سُکھ ابھی بھوگ نہ سکا تھا کہ وہ غائب ہوگئی تھی، پھر تو اس نے شادی سے ایسی توبہ کھینچی کہ بس! پھر کبھی شادی کا خواب تک نہ دیکھا۔ البتہ دوسرے بہت سوں کی شادیاں کروائیں ضرور! اُسے دوسروں کو رشتہ ازدواج سے بندھتے دیکھ کر ایک لطفِ خاص کا احساس نیز ایک گونا سکون میسّر آتا تھا۔

بہرحال! بھیا نے جستہ جستہ اپنی خوش خلقی اور حُسنِ شعار کی بدولت میر چندانی کے دل میں ایسا گھر کیا کہ سال پورا ہوتے ہوتے وہ انھیں کینٹین کی مینیجری سے ترقی دے کر سروے آفیسر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ تنخواہ بھی تین ہزار سے بڑھا کر پانچ ہزار کر دی۔ پھر کیا تھا، بھیا نے مجھے بھی بلوا بھیجا۔ میں گاؤں میں کھیتی باڑی کے کام سے لگا تھا۔ سب چھوڑ چھاڑ جھٹ پٹ ممبئی آن پہنچا اور کینٹین کی سپروائزری میں یوں جُتا کہ بس!

ممبئی شہر جس قدر وسیع القلب ہے ایسے ہی تنگ دامن بھی ہے۔ یعنی یہاں رہائش کا مسئلہ شدید ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دھاراوی کی وہ جھگی حاصل کرنے میں ہم دونوں بھائیوں کے دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ مگر اب بھیا کا باندرہ جیسے پوش علاقے میں فلیٹ وہ بھی بغیر کسی دقّت کے۔۔؟ حالانکہ ایسا بھی نہیں کہ بھیا کی تنخواہ یا دیگر آمدنی اسقدر بڑھ گئی ہو کہ وہ بہ آسانی فلیٹ افورڈ کر سکتے ہوں۔ مجھے باوثوق ذرائع سے یہ تک پتہ چل چُکا تھا کہ اُس فلیٹ کا سوسائٹی مینٹنینس بھیا کی تنخواہ کے برابر ہے۔ میں حیران تھا کہ آخر بھیا کو فلیٹ کی ضرورت کیوں آن پڑی؟ اگر دھاراوی کی گندی بستی سے نکلنا ہی مقصود تھا تو کُرلا میں ٹیکسی مینس کالونی یا کپاڈیہ نگر میں بھی فلیٹ لے سکتے تھے۔ غرض یہ کہ بھیا کا فلیٹ میرے ذہن کے خلیات میں رچ بس گیا تھا۔ سوچیں ہر لحظہ اسی فلیٹ کا طواف کرتی رہتیں، تصورات بھی اسی کے گرد منڈلاتے رہتے تھے اور میں اس کا محرّک جاننے کی خواہش میں دِن بے چینی میں اور راتیں کروٹیں بدلتے گزار رہا تھا کہ اچانک ایک دن بھیا کی شادی خانہ آبادی مژدۂ جاں فزا بن کر سماعت میں رس گھول گئی۔ کافی تحقیق اور کچھ ذاتی مشاہدات کی بناء پر یہ بات علم میں آئی کہ میر چندانی ہی کی ایما پر بھیا ایک گجراتی دوشیزہ کو جیون ساتھی بنانے پر راضی ہوئے ہیں۔ جبکہ وہ دو برس قبل گاؤں کے بھولو پردھان کی بیٹی لیلاوتی سے منسوب ہو چکے ہیں، لین دین کی رسم بھی ادا کی جا چکی ہے۔ پھر بھولو پردھان برادری کے بااثر شخصیات میں سے ہیں اور بھیا ہیں کہ یہاں غیر برادری میں۔۔؟ خاندان کی ناک کا کیا ہوگا؟ برادری میں تھوتھو تو ہوگی ہی۔۔۔ لوگ باگ حُقّہ پانی کا رشتہ ختم کر دیں گے، مرنے جینے کا کوئی شریک نہ ہوگا۔ بھیا کو یہ باتیں باور کرانے کی کوشش کی لیکن بے سود! اُنھوں نے میرے کہے پر کان نہیں دھرا اور پروگرام کے عین مطابق شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

شادی کے تمام اخراجات میر چندانی کے ذمہ تھا سو اُس نے اس میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ آرائش و زیبائش سے لیکر خورد و نوش کے تمام انتظامات اعلیٰ اور جدید طرز کے تھے۔۔۔ برات تو اس طمطراق سے نکلی تھی گویا کوئی دھنّا سیٹھ کی ہو، دیکھنے والے عش عش کر اُٹھتے تھے۔۔۔ سُہاگ رات کے لیئے ہوٹل تاج میں پورا ایک سوٹ بُک کیا گیا تھا اُسے سجانے سنوارنے کے لیئے ماہرین کی خدمات لی گئی تھیں۔ دُلہن کے بناؤ سنگار میں کئی مشاطائیں لگی تھیں، اُنھوں نے اُسے ایسا سنوارا تھا کہ الاماں! بطورِ لباس جسم پر ایک بکنی تھی اور عریانیت پر بڑی نفاست سے زیورات و جواہرات کی پیوندکاری کی گئی تھی۔ بہرکیف! دُلہن ابھی سجنے سنورنے کے مراحل ہی میں تھی اور دولھے راجہ کے من میں دُلھن سے ملاپ کے لڈو پھوٹ ہی رہے تھے کہ میر چندانی کے موبائل فون کا بجرنج اُٹھا۔۔۔ اُس نے موبائل پر کیا گفتگو کی؟ کال کرنے والا کون تھا؟ پتہ نہیں! لیکن اس آن سب کے سب چونک اٹھے تھے جب میر چندانی کے ہاتھ سے موبائل گر پڑا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبوچے صوفہ پر ڈھیر ہوگیا۔ اُسکی اس کیفیت پر بھیا اندر ہی اندر لرز اُٹھے تھے۔ کافی استفسار کے بعد اُس نے بتایا کہ کال گوا سے تھی، وہاں کینٹین اسٹاف اور کمپنی کے ایک ورکر میں کسی بات پر تُو تُو میں میں ہوئی، نوبت ہاتھا پائی تک آپہنچی۔ اور اس دوران کمپنی کے ورکر کا سر دیوار سے جا ٹکرایا اور وہ جگہ پر ہی دم توڑ دیا۔ کینٹین اسٹاف فرار ہے۔ یہ سُنتے ہی بھیا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں، کنپٹیوں سے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبل کر گردن پر ڈھلک آئی تھیں۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ اس مسئلے پر سوچتے دوبارہ میر چندانی کی ڈوبی ڈوبی سی آواز اُبھری۔

''کیلاش، تم سروے آفیسر ہو، اس معاملے کو بخوبی نپٹا سکتے ہو۔ اس سے پہلے کہ پولیس کے ہاتھ میری گریبان تک آئے فوراً گوا کے لیے نکل پڑو''۔

بھیا بھلا حکم عدولی کیونکر کر سکتے تھے۔ اُنکے جاتے ہی میر چندانی بھی یوں اُٹھ کھڑا ہوا گویا اس کی ڈوبتی نبض معمول پر آگئی ہو۔ رات کا گجر بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ لوگ باگ جو وہاں موجود تھے اپنی اپنی رِسٹ واچ پر نگاہیں گاڑیں اور جستہ جستہ وہاں سے کھسکنے لگے۔ چونکہ میں دولھے کا بھائی تھا اور دُلھن جو آٹھ دس گھنٹے قبل تک میرے لیے اجنبی تھی، اب میری بھابی بن چکی تھی، اس ناطے میری موجودی ناگزیر تھی۔ میر چندانی چونکہ بھیا کا مربّی تھا سو وہ بھی ڈٹا رہا۔ ہم دونوں کے علاوہ اندر سہاگ سیج پر میری نئی نویلی بھابی تھیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ وقت بھی کیسی کیسی نیرنگیاں دکھلاتا ہے کہ آن کی آن میں خوشیاں کافور ہو جاتی ہیں، سُکھ دُکھ میں بدل جاتے ہیں، تمنّائیں تشنہ کام رہ جاتی ہیں، ارمانوں کا خون ہو جاتا ہے!۔

''ارے بھائی کہاں کھو گئے؟''۔میر چندانی کی آواز پر میری سوچوں کا سلسلہ منقطع ہوا۔ ''آں!۔۔۔بس یوں ہی!''۔''بس یوں ہی کیوں؟ کہو تو تمھاری بھی شادی کروا دی جائے''۔ ''آپ کی ذرّہ نوازی ہے سر! لیکن ابھی میں کس قابل ہوں؟''۔

''شادی سے قبل مرد کسی قابل نہیں ہوتا لیکن جورو کے آتے ہی اسکے اندر تمام کی تمام قابلیتیں عود کر آتی ہیں''۔

کہتے ہوئے میری جانگھ پر چٹکی کاٹی اور معنیٰ خیز انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔اُسے اس طرح خود سے بے تکلّف ہوتا دیکھ میں نے سہمے سہمے لہجے میں اُسکی اپنی شادی کے بابت پوچھ بیٹھا۔وہ چونک پڑا اور پُرتشویش نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے لیکن قدرے متانت سے استفسار کیا۔

''کیا جانتے ہو تم میری شادی سے متعلق؟''۔

''کچھ زیادہ نہیں سر۔۔بس اتنا کہ آپ بھی پوِتر اگنی کے گرد پھیرے لے چکے ہیں''۔''اور؟''۔''اور۔۔۔اور۔۔۔اور یہ کہ۔۔۔!''

''ہاں ہاں بولو، گھبراؤ نہیں''۔اُسکا شوقِ تجسّس بیدار ہو گیا تھا۔''اور سر۔۔۔دُلہن۔۔۔دُلہن سہاگ سیج پر پہنچنے سے پہلے غائب ہو گئی تھی''۔ ''غائب نہیں بھاگ گئی تھی''۔غالباً وہ چیخ اُٹھا تھا۔''بھاگ گئی تھی!''۔لاشعوری طور پر میں بُدبُدایا تھا۔''ہاں!''۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''لیکن سر۔۔جب اُسے بھاگنا ہی تھا تو لگن کے لیئے ہامی کیوں بھری تھی؟ پوِتر اگنی کے پھیرے کیوں لیئے تھے؟''۔ ''تاکہ وہ بھاگ سکے''۔اُسکے منہ سے جھاگ اُڑنے لگی تھی۔''جانتے ہو کس کے ساتھ بھاگی تھی وہ؟''۔

''نہیں سر''۔''اچھا اندازاً بتاؤ وہ کس کے ساتھ بھاگی ہو گی؟''۔

''سر، عورت دولت پر ریجھتی ہے۔بھگوان کی دیا سے وہ تو آپ کے دیوڑھی کی لونڈی ہے۔ممکن ہے کالج کے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ۔۔!''۔ ''نہیں۔۔۔تمھارا اندازہ غلط ہے۔بوائے فرینڈ کے ساتھ تو شادی سے پہلے بھی بھاگ سکتی تھی''۔

میرا جملہ پورا ہونے سے پیشتر ہی بول پڑا تھا۔

''آخر کس کے ساتھ بھاگی ہو گی؟''۔

''میرے باپ کے ساتھ!''۔

اُس نے پورے فورس کے ساتھ کہا۔

''آں!''۔

میں چونک اُٹھا۔

''چونکو مت! میرا باپ اُس لڑکی کا دیوانہ تھا، اور وہ اُس کے ساتھ۔۔۔! لیکن وہ دُلہن بننے سے پہلے ایسا کچھ کرنا نہیں چاہتی تھی۔اس لیئے میرے باپ نے اُسے مجھ سے بیاہ دیا اور پھر لے اُڑا۔جانتے ہو وہ اُسے لیکر کہاں گیا؟''۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ خود ہی بول پڑا۔

''اسی ہوٹل میں لے آیا تھا اُسے''۔

''اسی ہوٹل میں!''۔

میں دوبارہ چونک پڑا۔

''ہاں! اور۔۔اور اسی کمرے میں''۔

کہتے ہوئے اُسکی آواز بھرّا گئی تھی۔۔آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔پھر جیسے اُس پر چُپ کی مُہر سی لگ گئی۔میری بھی کیفیت کچھ عجیب سی ہوتی جا رہی تھی تاہم مزید کچھ جاننے کی خواہشات اندر ہی اندر انگڑائیاں لے رہی تھیں کہ آخر اُس لڑکی کا کیا ہوا؟ کیا وہ اُس کے باپ کے ساتھ رہ گئی؟ باپ لوٹ کر دوبارہ گھر آیا بھی یا نہیں؟ اگر آیا تو کیسے بیٹے کا سامنا کیا ہو گا؟ کیا وہ لڑکی اُس بوڑھے کے ساتھ سُکھ شانتی سے نباہ کر سکی ہو گی؟۔ایسے ڈھیروں سوالات ذہن میں کُلبلانے لگے تھے۔غالباً اسی سبب مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہو چلا تھا۔میں نے ادھ کھُلی آنکھوں سے میر چندانی کی جانب دیکھا وہ صوفے پر لڑھک چکا تھا۔میں اُٹھا، صدر دروازہ جو محض بھڑا ہوا تھا اُسے بولٹ کیا، نائٹ لیمپ روشن کر کے کمرے کی تمام آرائشی وغیر آرائشی روشنیاں گُل کر دیں۔ایسا کرتے ہوئے قصداً سہاگ سیج والے کمرے میں جھانک بھی لیا۔دُلہن سیج پر یوں لجائی سمٹی سی بیٹھی تھی گویا اب بھی وہ اپنے خوابوں کے شہزادے کی آمد پر یقین رکھتی ہو۔مجھے اُس پر بڑا ترس آیا۔اور میں کرتا بھی کیا؟ چاروناچار اُلٹے قدموں آ کر دیوان پر لیٹ رہا۔آنکھیں کب لگیں؟ پتہ نہیں۔ہاں! جب آنکھیں کھُلیں سپیدۂ سحر نمودار ہوا چاہتا تھا اور دور کہیں مُرغ بڑی مستعدی سے بانگ دے کر صبح کا اعلان کر رہے تھے۔میں اُٹھ بیٹھا۔

''ارے! یہ کیا؟''۔

میر چندانی بیڈ پر موجود نہیں تھا۔کہاں چلا گیا؟ ذہن میں سوال مچلا۔ممکن ہے ٹوائلٹ یا باتھ روم میں ہو۔حوائجِ ضروریہ سے فارغ تو مجھے بھی ہونا تھا۔سو میں نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی، سگریٹ سلگاتے ہوئے یکلخت سہاگ سیج کا منظر آنکھوں کے آگے رقص کرنے لگا۔وہی لجائی سمٹی سی بیٹھی دُلہن، آنکھوں میں انتظار کے کانٹے۔۔! کیا وہ یوں ہی ساری رات بیٹھی رہی ہو گی؟ ذہن میں سوال گونجا۔ممکن ہے۔۔۔مشرقی تہذیب کا تقاضہ تو یہی ہے، دِل نے جواب دیا۔لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوا، آنکھوں سے دیکھنے کی للک اندر ہی اندر کسی ضدّی بچّے کی مانند مچلنے لگی۔سوچا اس سے پہلے کہ میر چندانی ٹوائلٹ سے نکل آئے کیوں نہ چُپکے سے ایک نظر سہاگ سیج والے کمرے میں ڈال لوں اور دیکھوں کہ دُلہن یوں ہی بیٹھی اپنے خوابوں کو آنسوؤں میں بہاتی آنکھوں ہی آنکھوں میں رات گزار دی یا اسے خوشیوں کا چھلاوہ جان کر اپنی تقدیر کی مانند خود بھی سو چکی ہے اور میں پلک جھپکتے ہی اُس کمرے کی دہلیز پر جا پہنچا۔پھر۔۔پھر میں حواس باختہ ہو گیا۔۔۔قدموں کو گویا کاٹھ مار گیا۔۔۔تن بدن میں کانٹے سے چبھنے لگے، اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور یکبارگی بھیّا کا فلیٹ میری نگاہوں کے آگے گردش کرنے لگا۔پھر تو یکے بعد دیگرے کئی برائیں مونٹاج (montage) کی شکل میں اُبھرنے اور معدوم ہونے لگیں۔آخری مونٹاج پر سہاگ سیج کا منظر سُپر اِمپوز (super impose) ہوا منظر ابھی پوری طرح واضح ہوا بھی نہیں تھا کہ مخالف سمت قدرے فاصلے پر ایک مردانہ ہیولیٰ اُبھر آیا جس کی شبیہہ میر چندانی سے مشابہت رکھتی تھی، جبکہ دونوں مناظر اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد تھے، لیکن چند ثانیے بعد ہی دونوں کا درمیانی فاصلہ بتدریج سُکڑنے لگا تھا۔شاید ہیولیٰ سہاگ سیج کی جانب کھینچا آ رہا تھا یا کہ سہاگ سیج خود اس کی اور کھینچی جا رہی تھی، پتہ نہیں!۔

□□□

سید احمد قادری
نیو کریم گنج، گیا (بہار)
8969648799

افسانہ

بھنور ماضی اور حال کا

خان مرزا بہادر کی پرانی حویلی پرانی یادوں کی آماجگاہ اب بھی بنی ہوئی ہے۔اس حویلی کے کئی حصے اب کرایہ داروں کی وجہ کر آباد ہیں اور خان مرزا بہادر کی اکلوتی اولاد خان صفدر بیگ بس دو کمروں میں سمٹ کر رہ گئے ہیں۔میرا اکثر ان کے یہاں آنا جانا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ بڑے خلوص اور محبت سے ملتے ہیں ویسے عام طور پر آس پاس کے لوگوں کے درمیان وہ ''بوڑھا کھڑوس'' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔لیکن مجھ سے انسیت کی وجہ شائد یہ ہے کہ میں ان سے خاص طور پر وقت نکال کر ملتا رہتا ہوں اور موجودہ سماجی اور سیاسی صورت حال کی زبوں حالی پر بھر پور تبصرے کرتا ہوں۔تاریخ میرا محبوب موضوع ہے اس لئے میں اکثر پرانے تاریخی حقائق سے عصری حالات کا تجزیہ کرتا،جس سے وہ بہت خوش ہوتے،اکثر میری باتیں سن کر وہ ٹھنڈی آہ بھرتے اور کہتے،وہ بھی کیا دن تھے۔ایسے دن تو اب لوٹ کر آنے والے نہیں ہیں لیکن ان پرانے دنوں کی یادوں کے سمندر میں اترا تو جا سکتا ہی ہے۔

ایسے ہی ایک دن جب وہ اپنی پرانی یادوں کے چراغ روشن کئے بیٹھے تھے،ان کی آنکھوں میں زبردست چمک تھی—اور اسی چمک سے فائدہ اٹھانے کے لئے آج میں نے ان سے وہ سوال کر دیا جسے اکثر وہ ٹال جاتے تھے—دراصل ان کے ایک بند کمرے میں طرح طرح کی پرانی چیزیں تھیں مثلاً گراموفون،گھڑیاں،کراکری وغیرہ کے ساتھ ساتھ شیر اور ہرن کی کھالوں سے آراستہ دیواریں اور فرش۔ان پرانے سامانوں کے درمیان بہت ساری پرانی تصاویر کے فریم اور ان تصاویر کے فریموں میں ایک تصویر ایسی تھی جو نہ جانے کیوں ہمیشہ میری توجہ کھینچ لیتی،ایسا لگتا کہ اس تصویر کے پیچھے کوئی بہت اہم لیکن نازک کہانی پوشیدہ ہے۔اس لئے کہ خان صفدر بیگ کمرے میں آویزاں تمام تصویروں کی تفصیل بتاتے لیکن اس تصویر کو وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر جاتے اور یہی وجہ تھی میرے تجسس کی کہ آخر اس تصویر کی تفصیل بیان کرنے سے خان صفدر بیگ کیوں گریز کرتے ہیں۔آج جب وہ پورے موڈ میں تھے اور پرانی یادوں کے چراغ کی روشنی سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا،میں پوچھ بیٹھا—''اور اس تصویر کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا،جس میں آپکے والد خان مرزا بہادر کو ایک انگریز عورت بڑے والہانہ انداز میں دیکھ رہی ہے—''

میرے اس سوال پر خان صفدر بیگ چونک پڑے—اور بولے—''اچھا وہ تصویر؟اس کے بارے میں تو آپ پہلے بھی کئی بار پوچھ چکے ہیں ٹھیک ہے تو آج سن ہی لیجئے''—میں ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گیا،میرا پورا دھیان ان کی طرف تھا۔وہ کچھ دیر خاموش رہے،غالباً واقعات کا سرا پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے یا پھر اس تصویر کے پیچھے کی چھپی کہانی کے سمندر میں خود ڈوب ابھر رہے تھے۔تھوڑی دیر بعد ان کی خاموشی ٹوٹی—اور وہ گویا ہوئے—''ہماری یہ حویلی دیکھ کر تو آپ کو اندازہ ہو گا ہی کہ ہم لوگوں کا ماضی کیسا رہا ہو گا،ہمارے دادا جان میر شفاعت حسین علی کی اس پورے علاقہ میں حکومت تھی۔اکثر انگریز افسران کی یہاں دعوت کا اہتمام ہوتا اور یہ اہتمام ایسا ہوتا کہ انگریز افسران کے درمیان بھی اس کی خصوصیت سے تعریف ہوتی۔میرے والد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے،بڑے ناز و نعم سے ان کی پرورش ہوئی،ابتدائی تعلیم کے بعد ان کے والد صاحب کے بے حد قریبی انگریز دوست رچرڈ کے مشورے پر انہیں آگے کی تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا گیا اور وہاں جا کر وہ وہاں کے ماحول میں پوری طرح گھل مل گئے۔بیرسٹری کی ڈگری ملتے ہی دونوں شادی کے لئے بضد ہو گئے۔ماریا کے فادر گزر چکے تھے اس کی ماں نے ماریا کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن ماریا بضد تھی اور آخر کار ماریا کی ضد کے سامنے،اس کی ماں نے سپر ڈال دی اور ان دونوں نے وہاں کی رسم و رواج کے مطابق شادی کر لی۔شادی کے بعد دونوں اپنے مستقبل کے خواب بننے لگے۔رنگ برنگے خواب،ہر خواب قوس قزح کی مانند جلوے بکھیرنے لگا۔دونوں نے وہیں بیرسٹری بھی شروع کر دی۔یہ خبر جب میرے دادا جان کو ملی تو ان کے پیروں تلے کی زمین ہی نکل گئی—

اس لئے کہ انہوں نے اپنے اس اکلوتے بیٹے کے لئے الگ بہت سارے خوشنما خواب دیکھ رکھے تھے اور انہیں امید تھی کہ خان مرزا بہادر تعلیم مکمل کرتے ہی یہاں آجائینگے اور ان کی شادی رئیس چھترپور، خان الطاف مرزا کی بیٹی، جو حسن کی ملکہ تھی، کے ساتھ اس طرح کرینگے کہ لوگ برسوں نہیں صدیوں یاد کریں گے — لیکن بیٹے کی کسی انگریز لڑکی سے شادی کی خبر کی آگ نے ان کے سارے خوابوں کو جھلسا دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا لیکن ان کی اہلیہ کو گہرا صدمہ لگا اور انہوں نے بستر پکڑ لیا۔ صدمہ اتنا گہرا تھا کہ تمام طبیب و حکیم ان کے علاج میں ناکام ثابت ہوئے، حالت دن بہ دن بگڑتی جارہی تھی — ان کی اس حالت کی اطلاع پیہ در پیہ کئی ٹیلی گرام کے ذریعہ ان کے چہیتے بیٹے کو دی گئی۔ خان بہادر مرزا کو ٹیلی گرام ملا، تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔ انہیں بھی اپنی ماں سے بہت پیار تھا۔ ماں کے ساتھ بتائے ایک ایک لمحے انہیں یاد آنے لگے — ماں کی شفقت، پیار، ان کا غصہ، ان کی لوریاں — ان یادوں نے ایسا سماں باندھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے — ماریا اور اس کی ماں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا تم اپنے وطن جاؤ اور اپنی ماں کو دیکھ آؤ اس طرح وہ طویل عرصہ کے بعد انڈیا آئے، ان کی آمد پر ان کی ماں زاروقطار کر روئیں ان کے والد کے بھی صبر وضبط کا باندھ ٹوٹ پڑا اور وہ بھی خوب روئے — اس وقت ایک عجیب سماں تھا — روتے روتے ماں نے ان سے ایک ایسا وعدہ لے لیا' جس کے لئے وہ ہرگز تیار نہیں تھے۔ آنسوؤں کے سمندر میں ڈوبی ماں نے کہا — بیٹے صاحب! اب آپ مجھ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، اگر گئے تو پھر میرا مرا منہ دیکھیں گے اور جذبات سے مغلوب ہو کر خان مرزا بہادر نے اس وقت حامی بھر دی، بعد میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اس وقت تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

چند ماہ اسی طرح گزر گئے، اس درمیان خان مرزا نے ماریا کو کئی خطوط لکھے اور ان خطوط کے جواب بھی آئے لیکن خان مرزا کے والد کی ان خطوط پر سخت نگاہ تھی اور انہوں نے اس خط و کتابت پر کڑے پہرے بٹھا رکھے تھے، نتیجہ میں ماریا کا کوئی خط خان مرزا تک نہیں پہنچ سکا، خان مرزا ذہنی طور پر بے حد پریشان رہے اس لئے بھی کہ ان کے آتے وقت ماریا حاملہ تھی۔ خط کا جواب نہیں ملنے پر انہوں نے کئی ٹیلی گرام دیا اور ان ٹیلی گرام کے جواب کا بھی حشر وہی ہوا، جو آئے ہوئے خطوط کا ہو رہا تھا۔ اس دوران خان مرزا کے والد یعنی ہمارے دادا جان نے انہیں وراثت سنبھالنے کے لئے مجبور کر دیا اور وراثت کی بیڑیوں نے انہیں بے دست و پا کر دیا اس کے بعد ماں کی ضد شروع ہوگئی کہ بس میں اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنے کے لئے زندہ ہوں۔ کیا میرا بیٹا، میری یہ آخری خواہش بھی نہیں پوری کرے گا۔؟ ایموشنل بلیک میل کا یہ سلسلہ اس طرح چلا کہ آخر ایک دن میرے والد نے ان کے آگے سپر ڈال دی اور پھر ان کی شادی ہوئی، ایسی شادی کہ لوگ آج بھی اسے یاد کرتے ہیں۔ میری والدہ بھی حسن و جمال میں ماریا سے کم نہیں تھیں، ماریا مغربی تہذیب کی پروردہ تھی تو میری والدہ مشرقی تمدن کی مجسمہ تھیں بی اس کے باوجود میرے والد ماریا کو بھولے نہیں اور اس بات کا علم بہت جلد میری والدہ کو ہو گیا۔ والد کی ماریا کے لئے تڑپ، بے چینی، بے قراری چھپائے نہیں چھپتی بی میری والدہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھیں۔ اس کا نہیں گہرا صدمہ ہوا اور وہ بیمار رہنے لگیں بی اسی دوران میری پیدائش ہوئی بی لیکن میری پیدائش سے قدرت کو خوشی نہیں ہوئی بی میری پیدائش کے ساتھ ہی میری والدہ گزر گئیں۔ نئی بہو کے جانے کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ میری دادی نے رخت سفر باندھ لیا اور ان دونوں کے بعد میرے دادا جان بھی سفر آخرت پر روانہ ہو گئے بی اب حویلی میں نوکر، نوکرانیوں کی بھیڑ میں میں تھا اور میرے والد خان مرزا بہادر بی میری پرورش کی ذمہ داری ایک گوسز کے سپرد کر دی گئی اور میرے والد حکومت کی ذمہ داریوں میں اس قدر گھر چکے تھے کہ شاید انہیں غم منانے کی بھی فرصت نہیں تھی دولت کے برستے مینھ میں وہ غم وخوشی کو فراموش کر چکے تھے۔ یا پھر اس میں گم ہو گئے تھے اپنے علاقہ کے لئے وہ پوسٹ آفس خرید چکے تھے، اب وہ ایک ہوائی جہاز خریدنا چاہتے تھے اور اسی بزنس ٹور نے انہیں ایک بار پھر لندن پہنچا دیا بی لندن کے راستے میں ماریا کی پرانی یادیں جھما جھم برسنے لگیں وہ احساسات و جذبات سے پوری طرح شرابور تھے۔ راستے بھر ان کا دل دھڑکتا رہا، ماریا سے ملاقات ہوگی۔ تو کیا ہوگا وہ مجھ سے لپٹ جائیگی، پہلے خفا ہوگی اور پھر مان جائیگی میری مجبوریوں کو وہ ضرور سمجھے گی میں اسے اپنے نئے جہاز سے انڈیا لے آؤنگا۔ اس کے پہنچتے ہی میری حویلی میں ایک بار پھر بہار آجائیگی۔ خوشیوں کے اس تلاطم میں وہ راستے بھر ڈوبتے ابھرتے رہے اور لندن پہنچتے ہی رپن اسٹریٹ کے اس مکان میں پہنچے۔ لیکن انہیں مایوسی ہوئی لوگوں سے وہ ماریا کا پتہ پوچھتے رہے اور ہر دوسرے، تیسرے مکان میں ماریا کو ڈھونڈتے رہے لیکن ماریا کہیں نہیں ملی۔

تھک ہار کر وہ ایک پارک میں بیٹھ گئے بی طرح طرح کے احساسات و جذبات کی آندھیاں ان کے ذہن میں چل رہی تھیں وہ کیسے ماریا کو تلاش کریں پارک کے اندر ان کی نظروں کے سامنے رنگ برنگ کپڑے پہنے، چھوٹے بڑے خوبصورت خوبصورت بچے کھیل رہے تھے اور شور بھی مچا رہے تھے ان بچوں میں ایک بے حد شوخ اور چنچل قسم کی لڑکی پر ان کی نظر نہ جانے کیوں ٹھہر گئی وہ اسے غور سے دیکھنے لگے، دیکھتے دیکھتے اچانک ایک جھماکہ ہوا ارے یہ تو بالکل ماریا کی طرح ہے وہ بے اختیار اٹھے بی اس بچی کے پاس گئے اس کا نام پوچھا پھر اس کے فادر کا نام جاننا چاہا جس پر وہ لڑکی خاموش رہی، لیکن جب ماں کا نام پوچھا تو اس نے جھٹ سے بتایا "ماریا" ماریا کا نام سنتے ہی خان مرزا کا دل ڈھڑکنے لگا بی اور اسی دھڑکتے دل کے ساتھ انہوں نے اس لڑکی سے اپنے گھر لے جانے کی گزارش کی لڑکی بڑی مشکلوں سے رضا مند ہوئی لڑکی نے گھر کے قریب پہنچ کر ایک گھر کی جانب اشارہ کیا اور پھر وہ دوڑتی ہوئی کھیلنے کے لئے پارک چلی گئی خان مرزا نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال بیل کا بٹن دبایا چند ساعت کے گزرنے کے بعد دروازہ کھلا سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی خان مرزا کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی وہ ماریا کی ماں تھی اس عورت نے سامنے کھڑے ایک اجنبی مرد کو دیکھا تو بڑے ترش لہجہ میں بولی "ہو آر یو بی"؟ نواب مرزا اس سوال پر ہکلاتے ہوئے بولے "آئی ایم خان مرزا بہادر فرام انڈیا" جواب سن کر اس بوڑھی عورت کی آنکھوں میں تحیّر کی چنگاریاں اٹھیں، اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور پھر وہ بپھر گئی بی "یو بلاڈی بی گیٹ آؤٹ۔ ماریا از نو مور بی شی از ان ہیون، اینڈ یو گو ہیل" یہ کہتی ہوئی اس نے دھڑاک سے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ خان مرزا بہادر کو زور کا جھٹکا لگا ماریا کے ملنے کی چراغ جو روشن ہوئے تھے، وہ ایک جھٹکے میں بجھ گئے۔ ان کے دل کی دھڑکن تیز اور بہت تیز ہوئی اور پھر اچانک اس نے دھڑکنا بند کر دیا۔ خان مرزا بہادر کے ساتھ گئے ان کے سکریٹری نے انہیں فوراً اسپتال پہنچایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ وہ ماریا کی موت کی خبر سنتے ہی اسی وقت اس سے ملنے روانہ ہو چکے تھے۔ جس دن خان مرزا بہادر کا سکریٹری ان کا جسد خاکی لے کر یہاں آیا اس دن پوری حویلی میں لوگوں کا اژدھام تھا بی ملک کے گوشے گوشے سے لوگ ان کے آخری سفر میں شریک ہونے آئے تھے۔ کئی دنوں تک تعزیت کے لئے آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔" اور اس دن کے بعد سے یہ حویلی سونی ہو گئی کوئی رونق نہیں کوئی زندگی نہیں کوئی۔" یہ کہتے ہوئے، خان صفدر بیگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں انہیں اداس اور ہمدردی بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

❑❑❑

قمر عباس قمر
توکل منزل، منیر پڈی، پلیا جے سی نگر، بنگلورو
9019624826

تبصرہ

اردو کی برکتیں

کتاب: ”اردو کی برکتیں“ کے تعارفی صفحے کے مطابق، جہانگیر انس (مجیب الرحمن) کا تعلق بہار کے ضلع سیوان سے ہے۔ وہ پیشے کے لحاظ سے تدریس سے وابستہ رہے اور ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی تحریروں میں زندگی کا گہرا مشاہدہ اور سماجی پہلوؤں پر ہلکی پھلکی چوٹ نظر آتی ہے۔

کتاب کا موضوع اور اسلوب ”اردو کی برکتیں“ بنیادی طور پر ظریفانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، مصنف نے اردو زبان، اس کے استعمال اور اس سے جڑی معاشرتی صورتحال کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

مزاح کا رنگ: مصنف کا مزاح ثقیل یا بوجھل نہیں ہے، بلکہ انہوں نے روزمرہ کے واقعات، جیسے کہ ”پیاز نامہ“، ”چائے“، اور ”بیوی کی یاد میں“ جیسے عنوانات کے ذریعے قاری کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی ہے۔

تجزیاتی پہلو: کتاب کے آغاز میں ”اردو کی برکتیں: تجزیاتی مطالعہ“ کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے۔ یہ مضمون کتاب کی ادبی اہمیت اور مصنف کے فن پر روشنی ڈالتا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات سے ہی ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے: اردو کی برکتیں: جو کتاب کا مرکزی عنوان بھی ہے۔ پیاز نامہ: اشیائے خورد و نوش پر مزاحیہ رنگ۔ بیوی کی یاد میں: گھریلو زندگی کے مضحکہ خیز پہلو۔ مولویت نامہ: مذہبی طبقے کے مخصوص رویوں پر ظریفانہ گفتگو۔ اردو کا جنازہ۔۔۔

جہانگیر انس کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ انہوں نے مشکل الفاظ کے بجائے محاوروں اور برجستہ جملوں کا استعمال کیا ہے جو ایک اچھے مزاح نگار کی پہچان ہے۔ طباعت و اشاعت: کتاب ”عرشیہ پبلی کیشن“ نے شائع کی ہے، جس کا گیٹ اپ اور ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔ صفحات کی ترتیب اور فونٹ واضح ہے، جس سے مطالعہ میں آسانی رہتی ہے۔ سماجی اصلاح: ان مضامین کا مقصد صرف ہنسانا نہیں بلکہ ہنسی ہنسی میں معاشرے کی تلخ حقیقتوں اور انسانی رویوں کی اصلاح کرنا بھی معلوم ہوتا ہے۔

”اردو کی برکتیں“ اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ یہ کتاب ان قارئین کے لیے بہترین ہے جو سنجیدہ ماحول سے نکل کر کچھ دیر کے لیے ہلکے پھلکے اور معیاری مزاح کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں۔ جہانگیر انس نے اپنے مخصوص بہاری لب و لہجے اور مشاہدے سے کتاب میں جان ڈال دی ہے۔ مصنف نے کس طرح کے موضوعات چھیڑے ہیں اردو کا جنازہ: اس مضمون میں مصنف نے بڑی خوبصورتی سے اردو زبان کی موجودہ حالتِ زار پر ماتم کرنے والوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے، مگر اس کا انداز رلانے والا نہیں بلکہ ہنسانے والا ہے۔ پیاز نامہ: جب پیاز کی قیمتیں آسمان کو چھوتی ہیں، تو ایک عام آدمی پر کیا گزرتی ہے، اسے مصنف نے ایک المیہ مزاح بنا کر پیش کیا ہے۔ جہانگیر انس کے ہاں طنز کی نشتر زنی کے بجائے مزاح کی گدگدی زیادہ ہے۔ وہ قاری کو ذلیل نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے ساتھ ہنسنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ جملہ واضح کرتا ہے کہ مصنف کا اسلوب مشتاق احمد یوسفی یا پطرس بخاری کی روایت سے متاثر ہے، جہاں مزاح کسی کی دل آزاری کے لیے نہیں بلکہ معاشرتی شعور بیدار کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

❑❑❑

کوائف

نامِ کتاب : اردو کی برکتیں
مصنف : جہانگیر انس
مبصر : قمر عباس قمر
ضخامت : 192 صفحات
قیمت : -/300 روپئے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشن

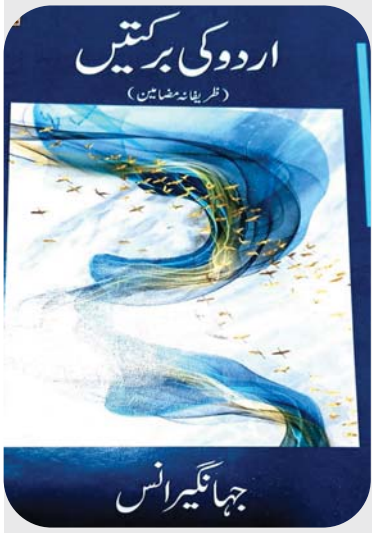

شیبا
سروجنی نگر، لکھنؤ
8400481310

ترقیات

نئے بھارت کا نیا اتر پردیش

ترقی اور تبدیلی کا سفر اتر پردیش (UP) ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے، جسے ملک کا دل کہا جاتا ہے۔ حالیہ برسوں میں، یوپی نے اپنی پرانی تصویر کو بدل کر ایک ایسی ریاست کی شکل اختیار کر لی ہے جو جدیدیت، صنعتی ترقی اور بہتر نظم و نسق کی مثال بن رہی ہے۔ نئے بھارت کا نیا اتر پردیش" محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک بدلتی ہوئی حقیقت ہے۔ انفراسٹرکچر میں انقلابی اتر پردیش کی پہچان اس کا شاندار انفراسٹرکچر ہے۔ آج یوپی کو ایکسپریس وے اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ ایکسپریس ویز: پوروانچل ایکسپریس وے، بندیل کھنڈ ایکسپریس وے اور زیر تعمیر گنگا ایکسپریس وے نے ریاست کے کونے کونے کو آپس میں جوڑ دیا ہے۔

فضائی رابطہ: نوئیڈا (جیور) میں بننے والا بین الاقوامی ہوائی اڈا اور ایودھیا کا ہوائی اڈہ ریاست کو عالمی سطح پر جوڑ رہے ہیں۔ اب یہاں چھوٹے شہروں میں بھی ہوائی سفر کی سہولتیں میسر ہیں۔ امن و امان اور بہتر نظم و نسق بھی ریاست کی ترقی کے لیے امن و امان (Law and Order) سب سے بنیادی شرط ہوتی ہے۔ نئے اتر پردیش میں جرائم کے خلاف "زیرو ٹالرنس" کی پالیسی نے سرمایہ کاروں میں اعتماد پیدا کیا ہے۔ خواتین کی حفاظت کے لیے پنک بوتھس اور مشن شکتی جیسے اقدامات نے سماجی ڈھانچے کو مضبوط کیا ہے۔ اقتصادی ترقی اور سرمایہ کار اتر پردیش اب ون ٹریلین ڈالر معیشت بننے کی راہ پر گامزن ہے۔ گلوبل انویسٹرسمٹ: کے ذریعے دنیا بھر سے کھربوں روپے کی سرمایہ کاری ریاست میں آئی ہے۔

اوڈی او پی اسکیم: ایک ضلع، ایک پروڈکٹ (One District One Product) اسکیم نے مقامی دستکاروں اور چھوٹے کاروباروں کو عالمی شناخت دلائی ہے، جس سے روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ مذہبی اور ثقافتی سیاحت نئے اتر پردیش نے اپنی ثقافتی وراثت کو جدیدیت کے ساتھ جوڑا ہے۔

اجودھیا: رام مندر کی تعمیر نے ایودھیا کو ایک عالمی سیاحتی مرکز بنا دیا ہے۔ کاشی وشوناتھ کوریڈور: بنارس (وارانسی) کی کایا پلٹ نے نہ صرف عقیدت مندوں کے لیے آسانی پیدا کی بلکہ مقامی معیشت کو بھی زبردست فروغ دیا۔ پریاگ راج: کمبھ میلے کے عالمی معیار کے انتظامات نے یوپی کی انتظامی صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ ریاست میں میڈیکل کالجوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اسمارٹ کلاس رومز کے ذریعے تعلیمی معیار کو بہتر بنایا جا رہا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں انٹرنیٹ کی رسائی اور ڈیجیٹل انڈیا کے اثرات نے نوجوانوں کے لیے نئے افق کھول دیے ہیں مختصراً یہ کہ "نئے بھارت کا نیا اتر پردیش" اب ملک کی ترقی کی رفتار کو کم نہیں ہونے دے رہا۔ یہ ریاست اب مسائل کا گڑھ نہیں بلکہ حل کا مرکز بن چکی ہے۔ اگر اسی رفتار سے ترقی جاری رہی، تو وہ دن دور نہیں جب اتر پردیش نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کا ایک بڑا اقتصادی اور صنعتی مرکز بن کر ابھرے گا۔

❑❑❑

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ فارما کانکلیو میں آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ گروپ فوٹو۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ سدھارتھ نگر مہوتسو کا افتتاح کرتے ہوئے۔

वर्ष : 79 अंक 12
अप्रैल, 2025
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए **विशाल सिंह**, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **आशिया ख़ातून**